احیائے اسلام اور من عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ (2026ء)

اپریل 2026ء

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اَخلاقِ کریمانہ

شیخ الاسلام کے اَخلاقی و روحانی خطابات

ایمان، حیا اور ادب کا باہمی تعلق

حضرت فرید ملت ڈاکٹر فرید الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

علمی و روحانی عظمت کا سفر

نظامِ تعلیم

معنویت و مقصدیت کا فقدان

سیرت وفضائلِ نبوی ﷺ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل عظیم ذخیرۂ علم

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی گراں قدر تصانیف

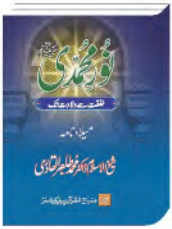

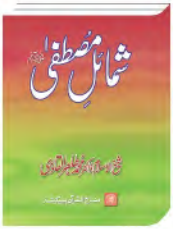

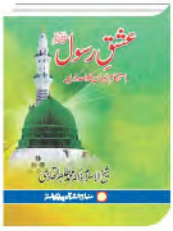

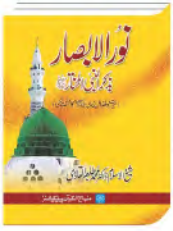

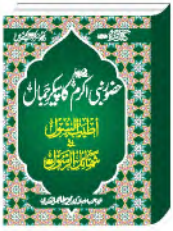

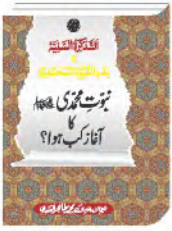

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جلد: 40 | شمارہ: 04 | شوال/ذوالقعدہ ۱۴۴۷ھ | اپریل 2026ء

بفیضان نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیر سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری مدظلہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی

ایڈیٹر: محمد یوسف

ایڈیٹوریل بورڈ
ڈاکٹر محمد رفیق نجم، ڈاکٹر محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی
محمد بلال اُپل، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی، حفیظ اللہ جاوید

مجلس مشاورت
خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین
مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ: حکیم الامت کی فکر اور آج کا مسلمان	(چیف ایڈیٹر)	5
القرآن: ایمان حیا اور ادب کا باہمی تعلق	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری	8
الفقہ: آپ کے فقہی مسائل	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	23
نظامِ تعلیم: معنویت اور مقصدیت کا فقدان	ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	28
انسانی زندگی اور وقت کی قدر و اہمیت	ڈاکٹر نعیم انور نعمانی	38
احسان اور اخلاص کی حقیقت	ڈاکٹر محمد اقبال چشتی	47
حضرتِ فریدِ ملت: علمی و روحانی عظمت کا سفر	محمد یوسف منہاجین	54
رمضان المبارک: حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ پر شیخ الاسلام کے خطابات		66
رمضان المبارک 2026ء: نئی شائع ہونے والی کتب کا تعارف	ڈاکٹر محمد فاروق رانا	86

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم | گرافکس: عبدالسلام | خطاطی: محمد اکرم قادری

قیمت فی شمارہ: 60 روپے | سالانہ خریداری: 700 روپے

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
www.minhaj.info
www.facebook/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس و سالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

انتباہ! مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ و ریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمد باری تعالیٰ

ہے تُو سب کا خالقِ کبریا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے
نہیں کوئی بھی کہیں دُوسرا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

تُو غفور ہے تو رحیم ہے، تری ذات سب سے عظیم ہے
ہمہ کبر و ناز تجھے رَوا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

ہوں وہ بحر و بر کہ شجر حجر، مہ و مہر یا مَلک و بشر
سبھی مانتے ہیں تجھے خدا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

ہے تو بادشاہوں کا بادشہ، ہوں مَیں ایک مفلس و بے نوا
ترا فضل مجھ پہ رہے سدا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

ہوں مَیں ایک بندۂ روسیہ، تری بارگاہ میں آ گیا
مجھے عفو کردے مرے خدا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

لگیں ٹٹلنے جب کہ عمل مرے، مجھے مغفرت کی سند ملے
تری مِلک میں ہے جزا سزا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

مَیں بتاؤں ایسے یہ زندگی، کہ ادا کروں حقِ بندگی
مرے سامنے ہو تری رضا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

ہے یہ آرزو دمِ مرگ بھی، ہو درِ نبیؐ پہ جبیں جھکی
مرے عجز کا تجھے واسطہ، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

تری قدرتوں میں دو جہاں، ہوں میں عہدِ عاجزؔ و بے نشاں
مَیں تو ایک ذرّہ ہوں خاک کا، تجھے حمد ہے تجھے حمد ہے

﴿ڈاکٹر مقصود احمد عاجز﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

متاعِ دو جہاں ہے آپ کے در کی جبیں سائی
زہے قسمت جسے یہ دولتِ کونین ہاتھ آئی

ہوئی ہے جب سے میرے دل میں ان کی جلوہ فرمائی
نہ اب وہ دل کی بے چینی، نہ اب تنہائی تنہائی

نہیں جو آشنا رسم و رہ رازِ محبت سے
نہ دیوانہ ہے دیوانہ ، نہ سودائی ہے سودائی

رہِ طیبہ میں تیرا ہر قدم وہ سرخرو ہونا
مبارک ہو مبارک ہو تجھے اے آبلہ پائی

احاطہ کیا کرے کوئی ترے لطف و عنایت کا
تری ممنون دیکھی ہیں کلیمی اور مسیحائی

مچل اے حسرتِ طیبہ تڑپ اے حسرتِ طیبہ
تڑپنے سے مچلنے سے تری ہوگی پذیرائی

حبیبؔ بے نوا کی آرزو اس کے سوا کیا ہے
کبھی میری بھی دل جوئی کبھی میری بھی شنوائی

﴿حکیم حبیبؔ العیشی﴾

اداریہ

حکیم الامت کی فکر اور آج کا مسلمان

برصغیر کی فکری، روحانی اور تہذیبی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے عہد کے مروجہ فکر و فلسفہ سے بلند ہو کر آنے والی نسلوں کے لیے راہنمائی کا روشن مینار بن جاتی ہیں۔ ان کی فکر محض ایک زمانے تک محدود نہیں رہتی بلکہ صدیوں تک انسانی اذہان کو بیدار اور دلوں کو منور کرتی رہتی ہے۔ ایسی ہی ایک نابغۂ روزگار ہستی کا نام حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہے، جنہیں دنیا شاعرِ مشرق سے جانتی اور مخاطب کرتی ہے۔

ہر سال جب 21 اپریل کا دن آتا ہے تو اہلِ فکر و دانش اس عظیم مفکر کی تعلیمات اور فکر و فلسفہ پر روشنی ڈالتے اور امت کو خودی کا فراموش کر دیا جانے والا سبق یاد دلاتے ہیں۔ حکیم الامت نے فقط مسلمانانِ برصغیر کو ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کو اعلیٰ اخلاقی انسانی اقدار اپنانے کی تحریک دی۔ حکیم الامت کی زندگی اور ان کی فکر کا مطالعہ دراصل ایک ایسے فکری سفر کا آغاز ہے جو انسان کو خود شناسی سے خدا شناسی تک لے جاتا ہے۔ علامہ محمد اقبال صرف ایک شاعر نہیں تھے بلکہ وہ ایک دانائے راز فطرت اور نباض عصرِ عظیم مفکر اور مصلح بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں علم، روحانیت، سیاست، فلسفہ اور ادب کا ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو تاریخ میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی گم گشتہ پہچان کروائی اور غیرت و حمیت کے ساتھ جینے کی سوچ دی۔ علامہ محمد اقبال کا کلام محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ پیغام ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں ایک طرف عشقِ رسول ﷺ کی حرارت ہے تو دوسری طرف ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کی یاد اور مستقبل کی امید بھی جھلکتی ہے۔ علامہ محمد اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فکری اور جسمانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا اور خودی کا درس دیا۔

حکیم الامت کی فکر کا سب سے بنیادی تصور "خودی" ہے۔ ان کے نزدیک خودی دراصل انسان کے اندر موجود وہ روحانی قوت ہے جو اسے عظمت اور بلندی کی طرف لے جاتی ہے۔ انھوں اپنے منظوم اظہارِ خیال کے ذریعے امت کو یہ پیغام دیا کہ اگر وہ اپنی خودی کو پہچان لیں اور اسے مضبوط بنالیں تو دنیا

کی کوئی طاقت انہیں ذہنی یا جسمانی اعتبار سے غلام نہیں رکھ سکتی۔ اقبال کا منظوم فلسفہ حیات کا ایک ایک نکتہ قرآن کریم کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور فلسفہ کے ذریعے یہ واضح کیا کہ مسلمان جب تک اپنی روحانی طاقت کو نہیں پہچانیں گے، اس وقت تک وہ حقیقی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ علامہ محمد اقبال کے نزدیک خودی کا استحکام علم، عشق اور عمل کے ذریعے ممکن ہے۔

علامہ محمد اقبال کی پوری فکر کا محور عشقِ رسول ﷺ ہے۔ ان کے اشعار میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار بار بار نظر آتا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے نزدیک مسلمان کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ وہ اپنے دل کو حضور نبی اکرم ﷺ کی محبت سے معمور کرلے اور اپنی زندگی کو سیرت نبوی ﷺ کے مطابق ڈھال لے۔ شاعر مشرق نے بارہا اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ جب تک مسلمان حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا معیار نہیں بناتے، اس وقت تک وہ حقیقی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ محمد اقبال کی شاعری میں عشق، ایمان اور عمل کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

آپ کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو پارہ پارہ ملتِ اسلامیہ کا درد ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کی نشاندہی بھی کی۔ علامہ محمد اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ان کا اپنے اصل پیغام سے دور ہو جانا ہے۔ حکیم الامت نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو صرف جذباتی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کا پیغام یہ تھا کہ مسلمان محض ماضی کی عظمت پر فخر کرنے کے بجائے حال اور مستقبل کی تعمیر پر توجہ دیں۔ جب ہم پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملک دراصل علامہ محمد اقبال کی فکری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کا تصورِ پاکستان ایک ایسی ریاست کا تھا جہاں عدل، مساوات اور اسلامی اقدار کو فروغ حاصل ہو۔

آج کا دور تیز رفتار تبدیلیوں کا دور ہے۔ دنیا میں فکری، سیاسی اور معاشی سطح پر بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ایسے میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ آج کے اس دور زوال میں جس طرف بھی نگاہ اٹھائیں تو امت کشت ویراں نظر آتی ہے، بھائی بھائی کا گلہ کاٹ رہا، امت کے وسائل اغیار کی دسترس میں ہیں، اس دور زوال میں ایک تحریک اور شخصیت ایسی ہے جو اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بکھری ہوئی امت کو یکجا کرتی نظر آتی ہے، وہ تحریک، تحریک منہاج القرآن ہے اور وہ شخصیت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ کی ہے۔ اس تحریک کا کردار حکیم الامت کے افکار و فلسفہ کی عملی تعبیر ہے۔ تحریک منہاج القرآن جوانوں کو اقبال کا شاہین

بنانے کے لیے انھیں علم، امن، محبت اور اخلاق سکھا رہی ہے۔ شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ کی فکر سے اعتدال اور توازن کے اسلامی اصولوں کا احیاء ہو رہا ہے، اور منتشر امت مسلمہ کو قرآن و سنت کے پرچم تلے یکجا کیا جا رہا ہے۔ شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ کا اسلوب دعوت و فکر وہی ہے جس کی طرف حکیم الامت نے توجہ مبذول کروائی۔

شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ فی زمانہ شرق و غرب نوجوانوں کو علمی و فکری اعتبار سے بیدار کر رہے ہیں۔ اگر ہم شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی خدمات کا جائزہ لیں تو آپ کی جملہ خدمات ہمیں فکرِ اقبال کی عملی تعبیر نظر آتی ہیں۔ شیخ الاسلام نے دینی و فکری خدمات کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشیات کے میدان میں بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیقات اور تصنیفات کے ذریعے واضح کیا کہ اسلامی اقتصادی نظام نہ صرف موجودہ معاشی بحرانوں کا مؤثر حل پیش کرتا ہے بلکہ عدل، توازن اور فلاحِ انسانی پر مبنی ایک پائیدار معاشی نظام کی تشکیل میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے تعلیمی وژن کی بات کریں تو ان کا تعلیمی وژن ایک ہمہ گیر فکری منصوبے کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کا مقصد علم کو محض تدریس یا پیشہ ورانہ ضرورت تک محدود رکھنا نہیں بلکہ اسے کردار سازی، فکری بیداری اور معاشرتی اصلاح کا مؤثر ذریعہ بنانا ہے۔ اِسی جامع تصور کے تحت انہوں نے تعلیمی میدان میں ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ ان کے قائم کردہ تعلیمی نیٹ ورک کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دینی اور عصری علوم کو ایک متوازن نصاب کے تحت یکجا کیا گیا ہے، تاکہ ایسے لوگ تیار ہوں جو علم، کردار اور فکری بصیرت کے اعتبار سے معاشرے کی رہنمائی کے قابل ہوں۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تعلیمی کاوشیں ایسے فکری اِحیاء کی نمائندگی کرتی ہیں جو علم کو قومی ترقی اور امت کی فلاح کے لیے بنیادی قوت قرار دیتی ہیں۔

اقتصادی اور تعلیمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے عصرِ حاضر میں اتحادِ امت کے فروغ کو اپنی دعوتی اور فکری جدوجہد کا بنیادی محور بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے خطبات، تصانیف اور عالمی سطح پر ہونے والی علمی و دعوتی سرگرمیوں کے ذریعے یہ پیغام عام کیا کہ امتِ مسلمہ کی قوت اُس کے اتحاد، اعتدال اور باہمی احترام میں مضمر ہے۔ شیخ الاسلام نے مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے، انتہا پسندی اور فرقہ واریت کی نفی کرنے اور مشترکہ اسلامی اقدار کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اُن کی علمی کاوشوں کا مقصد یہ رہا کہ مسلمان اختلافات کے باوجود مشترکہ دینی بنیادوں پر متحد ہوں اور باہمی احترام، رواداری اور اخوت کے ذریعے ایک مضبوط اور متوازن اسلامی معاشرے کی تشکیل کریں۔

(چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی)

ایمان، حیا اور ادب کا باہمی تعلق

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و تربیتی خصوصی خطاب

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔

(سورۃ الشمس، ۹۱: ۷۔۱۰)

”اور انسانی جان کی قسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قسم۔ پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی۔ بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی)۔ اور بے شک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)۔“

اللہ رب العزت نے انسانی نفس کو بدکاری اور پرہیزگاری کے درمیان تمیز کرنے کی معرفت اور خاص شعور عطا کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جبلت میں یہ بات ودیعت کر دی ہے کہ کون سے کام برے ہیں اور کون سے نیک۔ نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز کرنا اس نفس کی وہ بنیادی صلاحیت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر جان کے اندر رکھا ہے۔ یہ ایک Basic Potential (بنیادی استعداد)، Capability (قابلیت) اور Ability (صلاحیت) ہے جس کے ذریعے بندہ اچھائی اور برائی میں فرق کر لیتا ہے۔

انسانی نفس میں اچھائی اور برائی کی صلاحیت کا تعلق انسانی شخصیت کی تخلیق سے ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔ (الحجر، ۱۵: ۲۸)

" اور (وہ واقعہ یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں سن رسیدہ (اور) سیاہ بودار، بجنے والے گارے سے ایک بشری پیکر پیدا کرنے والا ہوں۔"

انسانی شخصیت کی تشکیل کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری پہلو جو سوکھی ہوئی مٹی اور گارے سے وجود میں آتا ہے۔ اس کے کچھ کیمیائی پہلو اور عناصر (Chemical Elements) ہیں۔ انسانی جسم کے یہ اجزاء زمین کی مٹی اور خوراک سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب یہ فرمایا گیا کہ تمہیں "تراب" (مٹی) سے پیدا کیا گیا، تو اس کی صورت یہ ہے کہ پودوں کے بیج مٹی کی خوراک کھا کر پروان چڑھتے ہیں اور جب ہم وہ پودے اور اناج کھاتے ہیں تو مٹی کے وہ تمام Extracts (خلاصہ/جوہر) ہمارے جسم کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر جانور بھی یہ ہی گھاس پھونس اور پودے کھاتا ہے اور اس کا جسم بھی اسی سے بنتا ہے۔ مٹی کے اندر موجود نمکیات اور توانائی کے اجزاء جانوروں میں جاتے ہیں اور جب ہم ان کا گوشت کھاتے ہیں تو ان عناصر سے ہماری زندگی تشکیل پاتی ہے۔

تخلیق کے اگلے مرحلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۔

" پھر جب میں اس کی (ظاہری) تشکیل کو کامل طور پر درست حالت میں لا چکوں اور اس پیکر (بشری کے باطن) میں اپنی (نورانی) روح پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر پڑنا۔" (الحجر: ۲۹)

یعنی جب میں انسان کے جسم کو متوازن بنا دوں، اسے برابر کر دوں اور وہ تمام Capabilities (قابلیتیں)، Abilities (صلاحیتیں) اور Potentials (استعداد) جو اسے دینی ہیں، اس کے اندر رکھ دوں اور اس کے اعضاء اور جسمانی قوتوں میں ایک Balance (توازن) پیدا کر دوں، تو پھر میں اس کے اندر اپنی روح پھونکوں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام میں "روحِ ربانی" پھونکی تو ان کے اندر نورِ ربانی کا چراغ روشن ہوا۔ اس مقام پر ملائکہ کو حکم ہوا کہ اسے سجدہ کرو۔

گویا قرآنِ مجید کی رو سے انسان جسمانیت اور روحانیت کا ایک Combination (مرکب) بن گیا۔ جسمانیت "مادیت" کو Reflect (ظاہر) کرتی ہے اور روحانیت "نورانیت" کو۔ گویا ہمارے

وجود میں مادہ اور نور دونوں شامل ہیں۔ اگر انسان میں جسمانیت بڑھتی چلی جائے اور وہی غالب آجائے تو وہ حیوانیت اور نفسانیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر روح کا عنصر اور روحانیت غالب آجائے، تو بندہ ملکوتی صفات، نورانیت اور فرشتوں کی خصلتوں کی طرف بلند ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ دونوں راستے رکھے ہیں، جن کا اشارہ سورۃ الشمس کی مذکورہ آیت نمبر 8 میں کیا گیا ہے کہ اس نفس میں "فجور" یعنی برائی کی طرف راغب ہونے اور گناہ کرنے کی صلاحیت بھی ہے، اور اس میں "تقویٰ" یعنی پرہیزگار، صاحبِ صفا اور ولی اللہ بننے کی ملکوتی صفت بھی ڈال دی گئی ہے۔ گویا انسانی نفس میں دونوں طرح کے Potentials (امکانات) بنیادی طور پر موجود ہیں۔

چونکہ اوپر دو چیزیں بیان ہوئیں: فجور اور تقویٰ یعنی نیکی اور برائی دونوں کا مادہ انسان میں موجود ہے، اس لیے آخر میں اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا۔

بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، اسے رذائل سے پاک کیا اور اس میں نیکی کی نشوونما کی۔

تزکیہ نفس کا مفہوم اور انسانی فطرت کے دو پہلو

لفظ تزکیہ کے دو بنیادی معنی ہیں:

۱۔ Purification (پاکی) ۲۔ Growth (نشوونما)

یعنی وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو ان تمام بری خصلتوں اور گناہ کرنے کے Potentials (مخفی صلاحیتوں) سے پاک کر لیا جو انسان کو برا بنانے والی، اس پر نفسانیت و حیوانیت کو غالب کرنے والی، یہاں تک کہ اسے شیطانیت کی حد تک لے جانے والی ہیں۔ انسان کے اندر یہ تمام Potentials موجود ہیں؛ وہ چاہے تو نفس پرست بن جائے، چاہے تو حیوان بن جائے اور چاہے تو شیطان بن جائے۔ یہ تمام امکانات آیتِ کریمہ کے لفظ "فُجُورَهَا" کے ذریعے اس کے اندر موجود ہیں۔ انسان خود اپنی شخصیت کا ذمہ دار ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام صلاحیتیں دے دی ہیں؛ وہ قاتل بننا چاہے تو قاتل بن جائے اور اگر محافظ بننا چاہے تو محافظ بن جائے۔ پس جس شخص نے اپنے نفس کو ان رذائل اور برائی کی طرف لے جانے والے عوامل سے پاک کر لیا، وہ کامیاب ہوا۔

تزکیہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ برائی کے غلبہ سے بچ کر اپنے اندر موجود نیکی کے Potential، یعنی ملکوتی صفات اور فرشتوں جیسی نیک خصلتوں کو پروان چڑھایا جائے، انہیں نشوونما دی جائے اور

Develop کیا جائے۔ یہ باقاعدہ ایک Process اور طریقہ کار ہے۔ اس کے برعکس جس نے اپنے نفس کو گناہوں میں ملوث کر دیا اور نیکی کے اس Potential کو دبا دیا جس نے اس کے اندر نور اور روحانیت پیدا کرنی تھی تو وہ شخص نامراد اور ناکام ہو گیا۔

اچھائی اور برائی کی طرف میلان انسانی شخصیت کے اندر رکھا گیا ہے

ان آیاتِ کریمہ کو سمجھنے کے بعد اب ہم خُلق اور ادب کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ یاد رکھیں! ہم جو کچھ بھی اچھائی یا برائی کرتے ہیں، اس کا میلان ہماری شخصیت کے اندر رکھا گیا ہے۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم کس طرح کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ والدین کیسی تربیت کرتے ہیں۔۔۔ ہمیں ماحول کیسا ملتا ہے۔۔۔ ہمارا اپنا Focus (توجہ) کن چیزوں پر ہے۔۔۔ ہم اپنی محنت، ریاضت اور مجاہدہ کس سمت میں کرتے ہیں۔۔۔؟ انسانی وجود میں اندھیرا بھی ہے اور روشنی بھی۔ اگر ہم غلط سمت، غلط صحبت اور غلط ماحول کا انتخاب کریں گے تو اپنے اندر کے اندھیرے کو بڑھائیں گے اور اگر ہم اچھی سنگت، اچھی رفاقت اور صالح اعمال پر محنت کریں گے تو اپنے اندر کی روشنی میں اضافہ کریں گے۔ یہ ہمارا اپنا Option (انتخاب) ہے۔ قرآنِ مجید نے فرمایا:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد، ۹۰: ۱۰)

"اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیے۔"

نیکی، بھلائی اور تقویٰ اختیار کرنے کی صلاحیت دراصل "خوبصورتی" ہے۔ جس طرح ظاہری دنیا میں ہم کسی کو خوبصورت یا بدصورت کہتے ہیں، اسی طرح انسان کے من کے اندر دو طرح کی صلاحیتیں ہیں: یہ خوبصورت اور عمدہ بھی ہیں اور بدصورت اور ناکارہ بھی ہیں۔ Potential Nature (فطرتِ بالقوہ) میں نیکی، تقویٰ اور اچھائی چھپی ہوتی ہے، جبکہ Actual nature (فطرت بالفعل) میں گناہ کا رجحان، لالچ اور نفس پرستی جیسے عناصر موجود ہوتے ہیں۔

انسان کے نفس کے اندر اچھائی اور خوبصورتی کی جو بنیادی قوت چھپی ہوئی ہے، ہمارا کام یہ ہے کہ اس اندرونی خوبصورتی اور عمدگی کو باہر نکالیں تاکہ وہ محض ایک دبی ہوئی صلاحیت نہ رہے بلکہ ہماری کی زندگی میں ایک "فعل" بن کر ظاہر ہو۔ جب ہم اس چھپی ہوئی صلاحیت کو Activate (متحرک) کر کے ایک عمل کی شکل دے دیتے ہیں، تو یہیں سے خُلق اور ادب کا آغاز ہوتا ہے۔

خلق اور ادب کی حقیقت

جب انسان کے باطن میں چھپی ہوئی اچھائی، عمدگی، بھلائی اور نیکی اس کی عملی زندگی میں ظاہر ہو کر

ایک عمدہ اور اچھا فعل بن جائے تو اسے خلق کہا جاتا ہے، جس کی جمع "اخلاق" ہے۔ یہی ہمارے Morals (اخلاقیات) بن جاتے ہیں۔ یعنی "خلق" ہمارے اندر سے برآمد ہوتے ہیں۔ بعد ازاں ہماری داخلی صلاحیتیں اور خارجی عوامل جیسے صحبت، علم، تربیت، پرورش اور ماحول کے سبب یہ نمو پاتے ہیں۔ انسان کی اپنی کوششیں بھی ان نیکیوں کو اندر سے نکالنے، انہیں بڑھانے، طاقتور کرنے اور Promote کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

جب یہ افعال پختہ ہو جائیں اور ہمارے میل ملاپ، گفتگو اور برتاؤ میں ظاہر ہوں تو یہ اخلاق کہلاتے ہیں۔ اگر ان اخلاق میں مزید خوبصورتی، نفاست اور عمدگی کا رنگ شامل کر دیا جائے تو اسے "ادب" کہتے ہیں۔ گویا اندرونی بھلائی اگر زندگی کا فعل بن جائے تو وہ "خلق" ہے اور اگر اس خلق میں مزید نکھار اور اعلیٰ درجہ کی خوبصورتی آجائے تو وہ "ادب" ہے۔ اخلاق کو Morals (اخلاقیات) کہا جاتا ہے جبکہ ادب کو Manners (آداب/سلیقہ) کہتے ہیں۔ یعنی اخلاقی اقدار کی ادائیگی کا طریقہ اگر سنور جائے اور اس میں حسن و جمال آجائے، تو وہ "طریقۂ ادائیگی" ادب بن جاتا ہے۔

عملِ صالح اور ادب

اس بات کو ایک اور پہلو سے سمجھیں ہم اپنی زندگی میں ہر لمحہ کوئی نہ کوئی کام یعنی "فعل" سرانجام دیتے ہیں؛ جیسے اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، کھانا پینا، ملنا جلنا یا نماز پڑھنا، یہ سب افعال ہیں۔ اب ہر کام کو کرنے کے لیے اللہ رب العزت کا ایک حکم یعنی "امر" موجود ہے کہ ایسا کرنا ہے اور ایسا نہیں کرنا، یہ جائز ہے اور یہ ممنوع ہے۔ اگر ہمارے تمام افعال اللہ کے امر کے تابع اور اس کے احکام کے مطابق ہو جائیں، تو وہ "فعل" اب "عملِ صالح" بن جاتا ہے یعنی ہمارے تمام افعال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ڈھل جانے کے سبب "اعمالِ صالحہ" میں بدل جاتے ہیں اور جب اس "عملِ صالح" کو نہایت عمدہ اور خوبصورت لباس پہنا دیا جائے تو وہ "ادب" کہلاتا ہے۔ فعل اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حکم کے مطابق ہو تو "عملِ صالح" ہے، اور اگر اس عملِ صالح کو اعلیٰ و عمدہ پیرائے میں ادا کیا جائے تو وہ "ادب" بن جاتا ہے۔

پس ترتیب یہ ہوئی کہ پہلے "امرِ الٰہی" سے "عملِ صالح" بنتا ہے۔۔۔ پھر عمل سے "خلق" (اچھا اخلاق) جنم لیتا ہے۔۔۔ اور جب اس خلق کو سلیقہ اور تہذیب میسر آجائے تو وہ "ادب" بن جاتا ہے۔ گویا کسی بھی عمل یا اخلاق کی ادائیگی کا وہ عمدہ اور خوبصورت طریقہ جو سلیقہ مندی اور تہذیب سے آراستہ ہو، ادب کہلاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے Culture (ثقافت/تہذیب) کا لفظ بھی دیا جاتا ہے کہ

اس عمل کی Culturing (تہذیب و آرائش) ہو گئی اور اس میں سلیقہ آ گیا۔

روزمرہ زندگی میں آداب کے مظاہر

آیئے! ادب کے اس تصور کو ہم اپنی روزمرہ زندگی کی چند مثالوں سے سمجھتے ہیں:

۱۔ جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں، تو کیا اسی حالت میں نکل جاتے ہیں جس میں سو کر اٹھے ہوں؟ نہیں، ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہم اپنے آپ کو کچھ بہتر کر کے گھر سے نکلتے ہیں۔

اسی طرح کیا ہم کپڑے صندوق یا الماری سے نکال کر بغیر استری کیے ہوئے پہن لیتے ہیں؟ تصور کریں کہ اگر کوئی شخص صندوق سے کپڑے نکالے اور انہیں استری کیے بغیر، ان کی سلوٹوں سمیت پہن کر باہر آ جائے تو وہ کیسا لگے گا؟ اگر کپڑے صابن سے دھلے ہوئے اور Dry Clean (صاف ستھرے) ہیں تو یہ "کپڑے کا خلق" یا اس کا "اخلاق" ہے۔ لیکن اگر وہی لباس بہترین طریقے سے Press (استری) کیا ہوا ہو، تو سمجھ لیجیے کہ یہ "لباس کا ادب" ہے۔ دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہننا اخلاق ہے اور انہیں استری کر کے، ان میں Matching (رنگوں کی ہم آہنگی) اور Contrast (تضاد) کا خیال رکھ کر پہننا لباس کا ادب ہے۔

جس طرح بغیر استری کے کپڑے پہننے والے کا تاثر دیکھنے والے پر اچھا نہیں پڑتا، بالکل اسی طرح انسانی طبیعتوں کا حال بھی ہے۔ کئی لوگوں کی طبیعتیں "استری شدہ" یعنی سلجھی ہوئی ہوتی ہیں اور کئی کی نہیں ہوتیں؛ ان کے مزاج میں بے استری کپڑوں کی طرح سلوٹیں ہوتی ہیں۔ طبیعت کی اسی بے ترتیبی اور اکھڑپن کو "برا اخلاق" یا "بد خلق" کہا جاتا ہے۔

میں نے دیہاتوں میں وہ وقت بھی دیکھا ہے جہاں لوگوں کے پاس صندوق بھی نہیں ہوتے تھے۔ لوگ اپنے کپڑے مٹی کے گھڑوں یا چٹوروں میں رکھا کرتے تھے۔ جب ان گھڑوں سے کپڑے نکالے جاتے تو وہ سلوٹوں سے بھرپور ہوتے تھے۔ اگر آج ہمیں ویسے کپڑے پہننے کو کہا جائے تو ہم اسے کبھی گوارا نہیں کریں گے۔ پس جس طرح ہم لباس کی سلوٹوں کو ناپسند کرتے ہیں، اہلِ ادب اپنی طبیعت، مزاج، اعمال اور اخلاق کے اندر ایسی سلوٹیں اور گندگی برداشت نہیں کرتے۔ وہ اپنی عادات کو دھو کر اجلا کرتے ہیں، انہیں استری کر کے سلجھاتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ Matching (موافقت) کے ساتھ انہیں "اخلاقِ حسنہ" اور پھر "ادب" میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

۲۔ عملی زندگی میں ادب کا یہ نظام ہر جگہ موجود ہے۔ جس طرح لباس پہننے کا ایک ادب ہے، ویسے ہی کھانے پینے کے بھی مخصوص آداب ہیں۔ اگر کوئی شخص دسترخوان پر بیٹھ کر تیزی سے کھانا

شروع کردے، دوسرے کے حصے سے لقمے اٹھائے، سالن اپنے کپڑوں پر گرائے اور منہ بھر کر باتیں کرے تو دیکھنے والا یہی کہے گا کہ یہ انسانوں کا نہیں بلکہ حیوانوں کا طریقہ ہے۔ کھانے میں "اخلاق" یہ ہے کہ حلال کھانا کھایا جائے اور کھانے کا "ادب" یہ ہے کہ اپنے آگے سے کھایا جائے، چھوٹے لقمے لیے جائیں اور تہذیب کے ساتھ کھایا جائے۔

۳۔ سونے جاگنے، چلنے پھرنے، حتیٰ کہ غم اور خوشی کے بھی آداب ہیں۔ اگر کوئی شخص خوشی میں بلند بانگ قہقہے لگائے، تالیاں پیٹے اور شور مچائے تو یہ اخلاق اور ادب دونوں کے منافی ہے۔

۴۔ اسی طرح جب ہم مسجد میں آتے ہیں تو مسجد کے جداگانہ آداب ہیں۔ وضو اور نماز کے اپنے ارکان، فرائض، واجبات اور سنن ہیں، مگر ان سب کے ساتھ ساتھ "آداب" بھی ہیں۔ سجدہ کرنے کا اپنا ایک ادب ہے۔

۵۔ جب ہم کسی سے ملیں تو سلام کرنے اور ملاقات کرنے کا بھی ایک ادب ہے۔ اگر ہم کسی سے ہاتھ ملاتے وقت اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیں، تو یہ "سلام کا ادب" نہیں ہے۔ ایسا کرنے والے کو لوگ "بداخلاق" کہیں گے کیونکہ اس نے عمل تو کیا مگر اس عمل کو ادب کا لباس نہیں پہنایا۔

قرآن مجید کو بلا وضو نہ چھونا اور اس کی تلاوت کے تقاضوں کو پورا کرنا قرآن کا ادب ہے۔ مسجد میں داخل ہونے، نماز ادا کرنے، حج اور عمرہ کے مناسک بجالانے کے اپنے اپنے آداب ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے حضور توبہ واستغفار کرنے اور دعا مانگنے کا بھی ایک سلیقہ ہے۔

الغرض دنیا میں انجام دینے والے ہر عمل کا اپنا ادب ہے۔ دوستی کے آداب ہیں، مریض کی عیادت کے آداب ہیں، میزبان اور مہمان بننے کے آداب ہیں، مجلس میں بیٹھنے کے بھی آداب ہیں۔ چلنے کے آداب یہ ہیں کہ انسان اکڑ کر اور تکبر سے نہ چلے بلکہ عاجزی اور دھیمے پن کے ساتھ چلے۔

اسی طرح زندگی کے تمام رشتوں میں ادب ہی بنیاد ہے۔ بہن بھائیوں کے ساتھ تعلق، والدین کی تکریم اور چھوٹوں پر شفقت؛ یہ سب آدابِ زندگی ہیں۔ اپنے برابر والوں سے ملاقات میں نرمی اختیار کرنا ادب ہے۔۔۔ ہمسائے کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ وہ ہماری ہمسائیگی میں رہنا پسند کرے، یہ پڑوسی کا ادب ہے۔۔۔ ہماری مجلس میں بیٹھنے والے کو سکون اور سرور ملے، یہ محفل کا ادب ہے۔۔۔ حتیٰ کہ مطالعہ کرنے، دوستی نبھانے اور راستے میں چلنے کے بھی آداب ہیں۔۔۔ راستے میں چلتے ہوئے پودوں، پرندوں، کتوں، بلیوں اور ہر جاندار کی زندگی کا خیال رکھنا بھی ادب میں شامل ہے۔

کسی کو بد تمیز کہنا کیسا ہے؟

ہمارے معاشرے اور روزمرہ کی زندگی میں "ادب" کے لیے ایک جملہ بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے کہ "فلاں شخص کو بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے"۔ اس لفظ "تمیز" سے مراد دراصل شعور ہے۔ جب اس شعور کو نکھار کر ایک عمدہ شکل دے دی جائے تو وہ "ادب" بن جاتی ہے۔ مگر یہاں ایک لطیف نکتہ بھی یاد رکھیں کہ جب ہم کسی دوسرے کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ "اسے تمیز نہیں ہے"، تو اس وقت دوسرے کی تمیز کا تو پتہ نہیں کہ وہ ہے یا نہیں، مگر یہ جملہ بولنے والے کی اپنی تمیز ضرور ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی کو یہ کہنا کہ "اسے بات کرنے، ملنے یا سلام کرنے کا طریقہ نہیں آتا"، دراصل خود ہمارے اپنے اخلاق اور ادب کی نفی ہے۔ ادب کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کرے، ناگواری یا زیادتی کی بات کرے تو اس زیادتی کا ردِ عمل ہمارے چہرے کے تاثرات یا زبان سے ظاہر نہ ہو۔ کسی کی برائی کے جواب میں اپنے اندر ناگواری پیدا نہ ہونے دینا ہی "حسنِ خلق" اور "حسنِ ادب" ہے۔

دعوتِ دین کا ادب: حکمت اور نبوی ﷺ طریقہ کار

دنیا بھر میں دین کی دعوت دینے والے مبلغین کے لیے یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ "دعوتِ دین" کے بھی مخصوص آداب ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کسی کو دین کی طرف بلائیں اور گفتگو کا آغاز ہی جہنم کے تذکرے سے کر دیں، یا اگر کوئی ہماری بات نہ مانے تو اسے دوزخی بنا دیں۔ یہ دعوت کا طریقہ نہیں ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔

"(اے رسولِ معظّم!) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے۔" (النحل، ۱۶: ۱۲۵)

دعوتِ دین کا پہلا ادب "حکمت" اور دانشمندی ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا مخاطب کون ہے۔۔۔؟ اس کی عمر، اس کی ذہنی سطح، اس کا مزاج اور اس کا پس منظر کیا ہے۔۔۔؟ کون سی بات اس پر اچھا اثر کرے گی اور کون سی برا۔۔۔؟ اگر ہم ان چیزوں کا لحاظ نہیں رکھتے تو ہم حکمت کے خلاف تبلیغ کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے اتنے سخت، تلخ اور بھونڈے طریقے سے دعوت دی کہ اگلا شخص دین سے متنفر ہو کر بھاگ گیا، تو ہم نے اسے قریب لانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔

حضور نبی نبی اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس سے دعوتِ دین کے ادب کی ایک عظیم مثال ملتی ہے۔ ایک نوجوان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑی جرأت کے ساتھ گناہ اور بدکاری کی اجازت مانگی۔ یہ سن کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین لرز گئے، مگر رحمتِ عالم ﷺ نے اس نوجوان کو شفقت سے قریب بلایا، اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ کر نہایت آہستگی سے گفتگو فرمائی۔

آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: "بیٹے! کیا تم پسند کرو گے کہ کوئی تمہاری ماں کے ساتھ یہ گناہ کرے؟" اس نے عرض کیا: "نہیں یارسول اللہ ﷺ! ایسا تو نہیں ہو سکتا۔" پھر آپ ﷺ نے اس کی بہن، خالہ، پھوپھی اور دیگر رشتوں کا ذکر کیا۔ جب وہ ہر رشتے کے بارے میں انکار کرتا گیا، تو آخر میں آپ ﷺ نے اسے سمجھایا کہ "بیٹے! تم جس کسی کے ساتھ بھی یہ گناہ کرو گے، وہ بھی تو کسی کی ماں، کسی کی بیٹی، کسی کی بہن یا کسی کی خالہ ہو گی۔"

جب آپ ﷺ نے اسے اس کے اپنے رشتوں کی مثال دے کر سمجھایا اور سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا، تو وہ نوجوان کہتا ہے کہ اس کے بعد مرتے دم تک میری نگاہ میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ یہ ہے دعوتِ دین کا وہ ادب جس نے ایک انسان کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔

دعوتِ دین میں پہلے حکمت ہے، پھر موعظہ حسنہ (خوبصورت نصیحت)۔ اگر ہمارا مخاطب کسی دوسرے مذہب، مسلک یا نظریہ کا حامل ہے اور ہمیں اس سے بحث یا مناظرہ کرنا پڑ جائے، تو پھر قرآن کا حکم ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (النحل، ۱۶: ۱۲۵)

"اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجیے جو نہایت حسین ہو۔"

اگر Debate (بحث) یا مجادلہ کرنا بھی پڑے، تو وہ "حسن" سے بڑھ کر "احسن" یعنی اعلیٰ ترین درجے کی عمدگی، خوش خلقی اور Courtesy (خوش اخلاقی) کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس میں مخاطب کے جذبات مجروح نہیں ہونے چاہئیں، اسے حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اور نہ ہی اسے "اوئے توئے" کہہ کر مخاطب کرنا چاہیے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ذرا سے اختلاف پر دوسروں کو گمراہ، بے ایمان، کافر یا جہنمی قرار دے کر اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ ہم ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جیسے پوری عمارت کو آگ لگا کر تباہ کر رہے ہوں۔

یاد رکھیں! دعوتِ دین حکمت اور دانائی سے شروع کریں، پیارے کلمات اور نصیحت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اگر ہماری رائے سے اختلاف رائے رکھنے والا ہمارے سامنے آئے تو ہمارے اندر ادب، اخلاق، نرمی اور مروت مزید بڑھ جائے۔ یہی دعوتِ دین کا اصل ادب ہے۔

تنظیمی اور سماجی زندگی کے آداب

دعوتِ دین دینے والے مبلغین، واعظین اور مصلحین کے لیے جہاں انفرادی آداب ضروری ہیں، وہیں جب ایک جماعت یا تنظیم بنتی ہے تو اس کے آداب الگ ہو جاتے ہیں۔ قیادت سنبھالنے کا اپنا ایک ادب ہے اور کارکن ہونے کا اپنا۔ قائد کا منصب بہت بڑا ہے؛ اگر وہ اپنے ماتحتوں کے لیے ماں باپ جیسا شفیق کردار ادا نہیں کرتا، تو وہ قیادت کے ادب سے ناواقف ہے۔ ایک حقیقی قائد وہ نہیں جو اپنے کارکنوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑکے، ان کی تذلیل کرے یا بات بات پر ان کی گرفت کرے۔ قیادت تو نام ہے شفقت، نگرانی، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا۔ قائد میں ماں جیسی ممتا اور باپ جیسا سایہ ہونا چاہیے، یہی قیادت کا اصل ادب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دینِ اسلام میں ہر عمل کے لیے ایک ظاہری اور باطنی حسن مقرر کیا گیا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی کام نہایت عمدہ طریقے سے انجام دینا، اس کے ظاہر و باطن میں وہ خوبصورتی پیدا کرنا جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، "ادب" کہلاتا ہے۔ ہمارا پورا دین ادب سے لبریز ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ "جس کے پاس ادب نہیں، اس کے پاس دین نہیں"۔ یا سادہ لفظوں میں "بے ادب، بے دین"۔ مگر یاد رہے، یہاں بھی ایک ادب ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے؛ اگر آپ کسی کو بے ادب دیکھیں تو اسے براہِ راست یہ نہ کہیں کہ "تم بے ادب یا بے دین ہو"۔ کسی کو بے ایمان یا جہنمی قرار دینا خود خلافِ ادب فعل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں سے ان کی عقل اور ذہنی استعداد کے مطابق بات کرو، یہی گفتگو کا ادب ہے۔

بارگاہِ الوہیت میں ادب: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا طرزِ کلام

دین اور دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جو ادب سے خالی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق، انبیاء و رسل ﷺ کی محبت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اہل بیت اطہار علیہم السلام، سلف صالحین اور اولیاء و صالحین رحمہم اللہ کی نسبت؛ ان سب میں ادب ہی کلید ہے۔ ان کا نام لینے، ان کا ذکر کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں ادب کے پہلو پوشیدہ ہیں۔

اللہ رب العزت کے ساتھ کلام کرنے کا ادب کیا ہے؟ اس کی ایک بہترین مثال قرآن مجید میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے ملتی ہے۔ سورۃ الشعراء میں ارشاد ہے:

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ۔ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ۔ (الشعراء، ۲۶: ۷۸۔۸۰)

"وہ جس نے مجھے پیدا کیا سو وہی مجھے ہدایت فرماتا ہے۔ اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔"

ابراہیم علیہ السلام کے اس طرزِ کلام پر غور کریں، یہاں ادب کی ایک نہایت باریک اور لطیف صورت نظر آتی ہے۔ ان آیات میں مختلف افعال کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ فرمایا: "اس نے پیدا کیا" اور "وہی ہدایت دیتا ہے"۔ پھر فرمایا: "وہی کھلاتا ہے" اور "وہی پلاتا ہے"۔ ان چاروں افعال (پیدائش، ہدایت، طعام، قیام) کی نسبت براہِ راست اللہ کی طرف کی۔

لیکن جب بیماری اور شفا کا ذکر آیا، تو ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ "وہی مجھے بیمار کرتا ہے اور وہی شفا دیتا ہے"۔ حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ بیماری اور شفا دونوں اللہ ہی کی طرف سے ہیں، مگر کلام کا ادب دیکھیے! بیماری چونکہ ایک "نقص" اور تکلیف ہے، اس لیے اسے اللہ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذَا مَرِضْتُ "اور جب میں مریض ہوتا ہوں"۔ بیماری کا ذکر اپنی طرف کیا اور شفا کا ذکر اللہ کی طرف منسوب کیا۔ یہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں کلام کا وہ اعلیٰ ادب ہے جو ایک نبی نے ہمیں سکھایا کہ خیر کی نسبت رب کی طرف کرو اور نقص کو اپنی طرف منسوب کرو۔

بارگاہِ خداوندی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ادب

اللہ رب العزت کے حضور کلام کے ادب کی ایک اور عظیم مثال سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ہے، جس کا ذکر قرآنِ مجید کی سورۃ المائدہ (آیات: 116 تا 118) میں ملتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے ان لوگوں کے سامنے سوال فرمائے گا جنھوں نے آپ کو الٰہ (خدا) یا خدا کا بیٹا بنا لیا تھا اور آپ کی پوجا شروع کر دی تھی۔ اس سوال کا مقصد دراصل ان مشرکین کی گرفت کرنا ہوگا جنھوں نے شرک کی راہ اختیار کی۔

قرآن کہتا ہے کہ اللہ پاک پوچھے گا: "اے عیسیٰ! کیا تو نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا میری اور میری ماں کی عبادت کرو؟" اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس کا منطقی جواب تو یہ بنتا تھا کہ "باری تعالیٰ! میں نے ایسا نہیں کہا تھا"۔ لیکن قرآن ہمیں یہاں ادب کی وہ لطافت اور نظافت سکھا رہا ہے جس کا تصور عام انسان نہیں کر سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے خود کو Defend (دفاع) نہیں کیا، بلکہ عرض کیا:

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ۔ (المائدۃ، ۵: ۱۱۶)

" اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو یقیناً تو اسے جانتا، تو ہر اس (بات) کو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں ان (باتوں) کو نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہیں۔"

سبحان اللہ! یہ اللہ کی بارگاہ میں کلام کا کتنا اونچا مقام ہے۔ اپنی سچی صفائی پیش کرنے کے بجائے معاملہ کو اللہ کے علم کے سپرد کر دینا ہی "ادبِ الوہیت" کا کمال ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ "میں نے نہیں کہا"، بلکہ یہ عرض کیا کہ "تو تو بہتر جانتا ہے"، یعنی اللہ کے علمِ کامل کے سامنے اپنی زبان کھولنا بھی خلافِ ادب سمجھا۔

حضرت خضر علیہ السلام اور بارگاہِ الٰہیہ کا ادب

اسی طرح جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی اور وہ ایک سفر پر روانہ ہوئے، تو وہاں پیش آنے والے واقعات میں بھی ادب کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے تین کام کیے: ۱۔ ایک مسکین کی کشتی میں عیب پیدا کیا (اسے توڑ دیا)، ۲۔ ایک لڑکے کو قتل کیا، ۳۔ دو یتیم بچوں کی گرتی ہوئی دیوار کو بغیر اجرت کے تعمیر کر دیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے کشتی توڑنے کی وجہ پوچھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے جواب دیا کہ پیچھے ایک ظالم بادشاہ آ رہا تھا جو ہر اچھی کشتی کو زبردستی قبضے میں لے رہا تھا۔ اگر ان غریبوں کی کشتی سلامت ہوتی تو وہ اسے چھین لیتا اور ان کا روزگار ختم ہو جاتا۔ قرآن اس جواب کو یوں نقل کرتا ہے:

فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا۔ (الکہف، ۱۸: ۷۹)

" پس میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کر دوں۔"

یہاں غور فرمائیں، چونکہ کشتی میں "عیب" ڈالنے کا ذکر تھا اور عیب ایک نقص ہے، اس لیے حضرت خضر علیہ السلام نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا کہ "میں نے ارادہ کیا"۔

لیکن جب ان یتیم بچوں کی دیوار کی تعمیر کا ذکر آیا، جس کے نیچے ان کے بزرگوں کا چھوڑا ہوا خزانہ دفن تھا اور اس کی حفاظت ایک نیکی اور بھلائی کا کام تھا، تو وہاں حضرت خضر علیہ السلام نے کلام کا اسلوب بدل دیا۔ آپ نے فرمایا:

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَیَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا۔

سو آپ کے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور آپ کے رب کی رحمت سے وہ اپنا خزانہ (خود ہی) نکالیں۔" (الکہف، ۱۸: ۸۲)

ان دونوں واقعات کا موازنہ (Comparison) کریں؛ جب "عیب" کا ذکر تھا تو فرمایا "میں

نے ارادہ کیا"، اور جب "بھلائی اور نفع" کا ذکر آیا تو اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف کر دی کہ "تیرے رب نے ارادہ فرمایا"۔ یہی وہ اصل ادب ہے کہ ہر خیر اور کمال کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے اور ہر نقص یا بظاہر نظر آنے والی برائی کا ذمہ دار اپنی ذات کو قرار دیا جائے۔ اسے بارگاہِ الوہیت کے ساتھ "ادبِ کلام" کہتے ہیں۔

یاد رکھیں! جب بھی اللہ رب العزت کا ذکر کیا جائے، تو ہر گز بے ادبی سے نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں ایک نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ جب ہم کہتے ہیں "اللہ ایسا کرتا ہے" یا "اللہ فرماتا ہے"، تو یہ جملے اللہ کی توحید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کلمات میں دونوں طریقے جائز ہیں؛ یعنی آپ "اللہ فرماتا ہے" بھی کہہ سکتے ہیں اور ادب کے اظہار کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" یا "اللہ ہمیں کھلاتے پلاتے ہیں" بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم، جب بھی اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، اس کی عبادت ہو، اطاعت ہو یا اس کے کلام (قرآنِ مجید) کی تلاوت ہو، تو انسان کا پورا وجود سراپا ادب ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ دورانِ تلاوت یا ذکرِ الٰہی توجہ کا کسی اور طرف بھٹک جانا بھی بے ادبی کے زمرے میں آتا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام سے حیا کا قرآنی تصور

تین چیزیں ہمیشہ یاد رکھیں: ایمان، حیا اور ادب۔

ایمان، حیا کے اندر ہے اور حیا ادب کے اندر پوشیدہ ہے۔ جب تک ہمارے تصورِ دین میں ادب قائم ہے، تب تک ہمارے اندر حیا قائم ہے اور جتنا حیا مضبوط رہے گا، اتنا ہی ایمان مضبوط ہو گا۔ اگر حیا کمزور ہوا تو ایمان رخصت ہونا شروع ہو جائے گا اور حیا تب ہی جاتا ہے جب ادب ختم ہو جائے۔ آپس کے تعلقات میں بھی ادب اور حیا کا لحاظ رکھنا عینِ ایمان کا تقاضا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے عمل سے قرآنِ مجید نے حیا اور ظرف کی بلندی کا ایک عظیم شاہکار بیان کیا ہے۔ آیئے! اس واقعہ سے حیا اور ادب کے چند مظاہر کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تقریباً سات سے نو سال قید میں گزارے۔ آپ کو قید میں بھجوانے والی زلیخا تھی، جو عزیزِ مصر کی زوجہ تھی اور جس نے آپ کو پالا تھا۔ جب اس کی خواہش پوری نہ ہوئی اور اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا۔ بعد ازاں زلیخا نے آپ پر الزام لگایا اور آپ علیہ السلام کو قید کروا دیا۔

نو سال کے طویل عرصہ کے بعد جب بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر بتانے کے لیے آپ کو دربار میں بلایا گیا تو اس وقت یوسف علیہ السلام چاہتے تو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے زلیخا کا نام لے کر اسے

رسوا کر سکتے تھے کہ اس نے مجھ پر غلط الزام لگایا لیکن انبیاء علیہم السلام کے ادب اور ان کی حیا کا عالم دیکھیے کہ جب بادشاہ کا قاصد پیغام لے کر آیا کہ آپ قید سے باہر تشریف لائیں تو آپ فوراً باہر نہیں آئے۔ آپ اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتے تھے، اپنا Defense (دفاع) کرنا چاہتے تھے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ یوسف گنہگار نہیں تھا۔ اصولی طور پر آپ کو قاصد سے یہ کہنا چاہیے تھا کہ "جاؤ بادشاہ سے کہو کہ وہ زلیخا سے پوچھے کہ حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی میں نے گناہ کا ارادہ کیا تھا یا مجھ پر الزام لگایا گیا؟" لیکن یہاں انبیاء علیہم السلام کے شعور اور حیا کا وہ معیار سامنے آتا ہے جس کی مثال پوری کائنات میں نہیں ملتی۔ چونکہ زلیخا نے آپ کو پالا تھا، آپ پر احسان کیا تھا، آپ نے ان کے گھر میں ایک طویل وقت گزارا تھا، یہ الگ بات کہ بعد میں وہ اپنی خواہش کی غلام بن کر انتقام پر اتر آئی، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے پرانے احسانات کا بھرم رکھا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کرتے وقت بھی زلیخا کو براہِ راست نشانہ نہیں بنایا بلکہ نہایت پردہ داری اور ظرف کے ساتھ بات کی۔ آپ نے بادشاہ کے سامنے زلیخا کا نام لینا گوارا نہیں کیا تاکہ اس کا پردہ چاک نہ ہو۔ علیہ السلام آپ نے اس قاصد سے فرمایا:

قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ۔ (یوسف، ۱۲: ۵۰)

"اپنے بادشاہ کے پاس لوٹ جا اور اس سے (یہ) پوچھ (کہ) ان عورتوں کا (اب) کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے؟"

آپ نے دوسری خواتین کا تذکرہ کر کے زلیخا کا پردہ رکھا لیکن جب ان عورتوں سے تفتیش ہوئی، تو زلیخا کا ضمیر پکار اٹھا اور وہ خود بول پڑی:

الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ۔ (یوسف، ۱۲: ۵۱)

اب تو حق آشکار ہو چکا ہے (حقیقت یہ ہے کہ) میں نے ہی انہیں اپنی مطلب براری کے لیے پھسلانا چاہا تھا اور بے شک وہی سچے ہیں۔"

اس نے اعتراف کر لیا کہ غلطی اس کی تھی اور یوسف سچے ہیں۔ یہ حیا ہے۔ جب حیا ہوتا ہے تو ادب جنم لیتا ہے اور جب ادب ہوتا ہے تو ایمان کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

۲۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا بڑا امتحان وہ تھا جب بچپن میں ان کے بھائیوں نے بے وفائی کی، انہیں کنویں میں پھینکا اور پھر غلام بنا کر بیچ دیا۔ چالیس سال بعد جب والدِ گرامی سیدنا یعقوب علیہ السلام اور تمام بھائی مصر پہنچے اور یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا تو اس وقت آپ کا اپنے والد سے گفتگو کا انداز دیکھیے آپ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ۔ (یوسف، ۱۲: ۱۰۰)

"اور اللہ نے مجھ پر بڑا احسان کیا جب اس نے مجھے جیل سے نکال لیا۔"

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جیل کا واقعہ تو مصر کا مقامی معاملہ تھا، اس کا بھائیوں کی اس زیادتی سے کوئی تعلق نہیں تھا جو انہوں نے چالیس سال پہلے کی تھی۔ یوسف علیہ السلام نے اللہ کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے "کنویں سے نکالنے" کا ذکر نہیں کیا، بلکہ "جیل سے نکالنے" کا ذکر کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر وہ کنویں کا ذکر کرتے تو سامنے بیٹھے ہوئے بھائیوں کو شدید Embarrassment (شرمندگی) ہوتی، انہیں اپنی پرانی خطا یاد آتی اور وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ آپ علیہ السلام نے انہیں شرمندہ کرنا گوارا نہیں کیا اور حیا اور پردہ داری کا ایک اعلیٰ تصور قائم فرما دیا۔

۳۔ مزید براں، جب اس پورے معاملہ کی وجہ بیان کی، تو اپنا نام پہلے رکھا۔ فرمایا:

وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ۔ (یوسف، ۱۲: ۱۰۰)

"اور آپ سب کو صحرا سے (یہاں) لے آیا اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد پیدا کر دیا تھا۔"

حالانکہ حقیقت میں فساد تو بھائیوں نے کیا تھا، یوسف علیہ السلام تو معصوم بچے تھے جن پر ظلم ہوا تھا، آپ کا اس فتنہ میں کوئی کردار نہیں تھا۔ مگر کمالِ ظرف دیکھیے کہ بھائیوں کو براہِ راست مجرم ٹھہرانے کے بجائے فرمایا کہ شیطان نے "میرے اور میرے بھائیوں کے" درمیان رخنہ ڈال دیا تھا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی ذات کو بھی اس میں شامل کر لیا تاکہ بھائیوں پر سارا بوجھ نہ پڑے اور وہ خود کو تنہا گنہگار نہ سمجھیں۔

یہ ہے وہ ادب اور حیا کا عالم جو انبیاء علیہم السلام نے انسانیت کو عطا کیا ہے۔ ہمیں اپنے معاشرے، اپنی گفتگو اور اپنے کردار میں یہی نبوی شعور پیدا کرنا ہوگا کہ کس طرح دوسروں کے عیوب پر پردہ رکھا جاتا ہے اور کس طرح اپنے مخالفین کو بھی عزت و احترام کے ساتھ ڈیل (Deal) کیا جاتا ہے۔ ہمیں انبیاء علیہم السلام کی ان سنتوں سے اپنے شعور کو جلا بخشنی چاہیے کہ کس طرح مشکل وقت میں بھی ادب اور حیا کا دامن نہیں چھوڑا جاتا۔

(جاری ہے)

الفقہ

آپ کے فقہی مسائل

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیر نگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: مختلف رشتوں میں ناچاکی کی صورت میں انسان کیا کرے؟

جواب: قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد ہے:

وَقَضَى رَبُّكَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا. (بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۳)

اور آپ کے رب نے حکم فرمادیا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کیا کرو، اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں ''اُف'' بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان دونوں کے ساتھ بڑے ادب سے بات کیا کرو۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم فرمایا ہے۔ ان کو گالم گلوچ کرنا، جھگڑنا، انہیں جھڑکنا اور ان کے سامنے چلانا تو در کنار اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے کراہت کا اظہار کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ (النساء، ۴: ۱۹)

اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے برتاؤ کرو۔

حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي.

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے اچھا ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔

(ترمذي، السنن، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فضل أزواج النبي، ۵: ۷۰۹، رقم: ۳۸۹۵)

معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت اور بیوی سے حسنِ سلوک میں توازن رکھنا اہم شرعی ضرورت ہے۔ کسی ایک رشتے کے حقوق کی ادائیگی کرتے ہوئے کسی دوسرے رشتے کی حق تلفی نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح کسی رشتہ دار کی ایسی بات ماننا جائز نہیں جس میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی ہو۔ کیونکہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ.

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔

(أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۱۳۱، رقم: ۱۰۹۵)

ہمیں چاہیے کہ اپنے والدین اور گھر کے دیگر افراد کے ساتھ لڑائی، جھگڑا مت کریں۔ اپنے والدین کی خدمت اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم سے والدین کی کوئی گستاخی ہو جائے تو اس کی اُن سے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اگر والدین کوئی خلافِ شرع حکم دیں تو اس پر عمل نہ کریں لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ عزت و احترام سے پیش آئیں۔ رشتوں کے ساتھ تعلق میں اعتدال و توازن برقرار رکھیں۔

سوال: شریعتِ اسلامیہ کی نگاہ میں مثالی شوہر کو کیسا ہونا چاہیے؟

جواب: اسلامی شریعت کے مطابق رشتہ طے کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ لڑکے اور لڑکی کے قد کاٹھ، شکل و صورت، تعلیم و تربیت میں ہر ممکن حد تک مناسبت پائی جائے تاکہ دونوں میں ہم آہنگی، مطابقت و موافقت اور الفت قائم ہو سکے۔ بے جوڑ اور غیر مناسب رشتوں سے بچا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ. (النساء، ۴: ۳)

تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں۔

اس آیت مبارکہ کے مطابق پسندیدگی دو طرفہ ہے، صرف لڑکے کو لڑکی پسند ہونا کافی نہیں ہے بلکہ

لڑکی کو بھی لڑکا پسند ہونا ضروری ہے، پھر ہی دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور شادی کے مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں میں محبت و مودت ہو اور ایک دوسرے سے سکون پائیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ.

غیر شادی شدہ کا نکاح اس سے پوچھے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کا بغیر اجازت نکاح نہ کیا جائے۔ (بخاری، الصحیح، کتاب النکاح، باب لا ینکح الأب وغیرہ البکر والثیب إلا برضاھا، ۵: ۱۹۷۴، رقم: ۴۸۴۳)

انتخاب زوج کے لیے یہ بنیادی چیزیں ہیں جنہیں نظر انداز کر کے اکثر لوگ لڑکے کے مال و دولت کو دیکھ کر لڑکیوں کی زندگیاں برباد کر بیٹھتے ہیں۔ اگر لڑکے کے پاس زیادہ مال و دولت کی بجائے ضروریات زندگی پوری کرنے کی استطاعت اور اچھا کردار ہو تو دونوں کی زندگی میں محبت و سکون اور اللہ تعالیٰ کی رحمت جیسی نعمتیں بآسانی نازل ہو سکتی ہیں۔ اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت یحییٰ بن ابی کثیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ أَمَانَتَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ كَائِنًا مَنْ كَانَ، فَإِنْ لَا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ، أَوْ قَالَ: عَرِيضٌ۔

جب تمہارے پاس ایسے شخص کے نکاح کا پیغام آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے نکاح کر دو خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں بہت زیادہ فساد اور فتنہ پھیلے گا۔ (عبد الرزاق، المصنف، ۶: ۱۵۲، رقم: ۱۰۳۲۵)

حدیث مبارک میں ہے کہ اچھا شوہر وہی ہو گا جو ذیل میں مذکور حدیث مبارک کے جملہ امور پر عمل کرنے والا ہو گا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَنْ يُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمَ وَأَنْ يَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَى وَلَا يَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا يُقَبِّحْ وَلَا يَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ.

جب خود کھائے تو اسے بھی کھلائے، جب خود پہنے تو اسے بھی پہنائے۔ اس کے منہ پر نہ مارے، اسے برا نہ کہے اور گھر کے علاوہ تنہا کہیں نہ چھوڑے۔ (ابن ماجہ، السنن، کتاب النکاح، باب حق المرأۃ علی الزوج، ۲: ۴۱۷، رقم: ۱۸۵۰)

لہٰذا بہترین انتخاب زوج کے لئے معیار یہ ہونا چاہیے کہ مرد دین دار، با اخلاق اور وسیع النظر ہو اور اہل خانہ کو نیکی کی رغبت دلانے والا، حلال رزق کمانے والا اور اپنے خاندان یعنی بیوی اور بچوں کی کفالت کا اہل ہو۔

علاوہ ازیں مرد کو حلیم الطبع، بہادر، خوش خلق، عورت سے بھلائی کرنے والا، اچھے کاموں سے محبت والا خصوصاً بیوی کے اچھے کاموں پر دل کھول کر داد دینے والا، احسان کرنے والا، ظلم و تشدد سے پرہیز کرنے والا اور معاملاتِ زندگی میں بہترین منظم اور معاشی لحاظ سے خود کفیل ہونا چاہیے۔

سوال: مقدس اوراق اور غلافوں کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے؟

جواب: فقہائے کرام نے لکھا ہے:

ألمصحف إذا صار خلقا لا يقرأ منه ويخاف أن يضيع يجعل فى خرقة طاهرة ويدفن و دفنه أولى من وضعه موضعا يخاف أن يقع عليه النجاسة أونحو ذلك ويلحد له لانه لو شق و دفن يحتاج إلى أهالة التراب عليه وفى ذلك نوع تحقير إلا إذا جعل فوقه سقف بحيث لا يصل التراب إليه فهوحسن أيضاً. ألمصحف إذا صار خلقا و تعذرت القراءة منه لا يحرق بالنار.

(الشیخ نظام و جماعۃ من علماء الھند، الفتاوي الھندیۃ، ۵: ۳۲۳)

"جب قرآن کریم پرانا ہو جائے اور پڑھا نہ جائے اور ضائع ہونے کا ڈر ہو تو اسے پاکیزہ کپڑے میں باندھ کر دفن کر دیا جائے اور دفن کرنا اس سے بہتر ہے کہ کسی ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس پر نجاست وغیرہ پڑنے کا ڈر نہ ہو اور دفنانے کے لئے لحد کھودے کیونکہ اگر سیدھا گڑھا کھودا اور اس میں بوسیدہ قرآن دفن کر دیا تو اوپر مٹی ڈالنے کی ضرورت پڑے گی اور اس میں ایک طرح کی بے ادبی ہے ہاں اگر اوپر چھت ڈال دے کہ قرآن کریم تک مٹی نہ پہنچے تو یہ بھی اچھا ہے۔ قرآن کریم جب بوسیدہ ہو جائے اور اس سے قرات مشکل ہو جائے تو اسے آگ میں نہ جلایا جائے"۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بوسیدہ اوراق قرآن کریم کے ہوں یا حدیث پاک کے یا کسی دینی کتاب کے جن میں قرآن و حدیث کے حوالے نقل کئے گئے ہوں، ان کو جلایا نہ جائے اور مذکورہ بالا طریقہ سے ان کو دفنا دیا جائے مگر اس خیال سے کہ آج کل دفنانے کے لئے محفوظ زمین کا ملنا مشکل ہے بالخصوص شہروں میں نیز جہاں محفوظ جگہ سمجھ کر ان اوراق کو دفنایا گیا ہے عین ممکن ہے کہ کوئی انسان لاعلمی میں اس جگہ پر پیشاب کرے اور گندے اثرات ان اوراق مبارکہ تک پہنچ جائیں۔ دریا برد کرنے میں بھی بے ادبی کا آج کل بہت امکان ہے جبکہ اختلاف و انتشار امت سے بچنے اور فتنہ و فساد کے امکانات ختم کرنے کی خاطر صحابہ کرام کی موجودگی میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے نسخوں کو جلوا دیا اور کسی صحابی نے اس پر انکار نہ کیا پس جلانے کے جواز پر جبکہ نیت قرآنی تقدس کی حفاظت کرنا ہو معاذ اللہ بے ادبی کرنا نہ ہو، صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے اسی لئے فقہائے کرام نے بہت نرم لہجے میں جلانے سے منع فرمایا مگر جلانے پر کوئی سخت حکم نہ لگایا کہ اس کے جواز کی بنیاد موجود تھی۔

لیکن دور حاضر میں مقدس اوراق کو بے ادبی سے بچانے کا مسئلہ انتہائی پریشان کن اور تکلیف دہ صورت حال اختیار کر چکا ہے۔ ایسی صورت حال کہ جس سے بچنا قریب قریب ناممکن ہے۔ لہٰذا جس حد تک ہو سکے بے ادبی سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملہ میں چند اقدامات عمل میں لانے کی اشد ضرورت ہے جو درج ذیل ہیں:

- سب سے پہلے تو لوگوں میں ان کی بے ادبی کے بارے میں شعور پیدا کیا جائے تاکہ لوگ ان کا غلط استعمال نہ کریں۔
- جن جن جگہوں پر ان کا عام استعمال کرنا باعث بے ادبی ہے وہاں کوئی متبادل طریقہ کار اپنایا جائے۔
- مقصد حاصل کرنے کے بعد ان کو محفوظ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔
- آج کل ان کو ندی نالے، نہر یا دریا میں نہ گرایا جائے کیونکہ ایک تو پرنٹنگ ہونے کی وجہ سے سال بھر پانی بھی میں پڑے رہنے سے الفاظ قائم رہتے ہیں اور دوسرا ندی نالے بھی گٹر، جوہڑ اور غلاظت سے پُر ہیں۔ لہٰذا اوراق مقدسہ کو ان میں ڈالنا بھی بے ادبی ہے۔ اس لیے بہتر حل یہ ہے کہ ان کو جمع کر کے پلانٹ کے ذریعے ان سے دوبارہ کاغذ، گتہ وغیرہ تیار کیا جائے تاکہ بے ادبی سے بھی بچ جائیں اور فائدہ بھی حاصل کیا جا سکے۔ اترنے والی سیاہی کو دھوپ یا پلانٹ کے ذریعہ خشک کر دیا جائے۔

چند مقامات پر پرانے بوسیدہ قرآن کریم کے نسخوں کو لاکھوں روپے لگا کر ان کی حرمت اور جلد بندی کر کے ان کو عمدہ الماریوں میں رکھ کر محفوظ کیا جاتا ہے۔ ان نسخوں کو نہ کوئی پڑھتا ہے، نہ ہاتھ لگاتا ہے۔ صرف نمائش کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ نیت میں خلوص ہو تو یہ کام بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ مگر اس کا امت کو فائدہ کیا ہے؟ یہ سوالیہ نشان ہے اور رہے گا۔ کیونکہ اب لوگ خوشحال ہیں۔ ماشاءاللہ عمدہ کاغذ، رنگین طباعت، حسین جلدیں، مضبوط پلاسٹک کور اور صحیح ترنسخے تلاوت کے لیے مفید و مقبول ہیں۔ اس لیے اب ان قرآن محلات کو عمدہ لائبریریوں میں بدل دیا جائے۔ قرآن و سنت کے جدید اور عمدہ نسخے ان میں مہیا کئے جائیں۔ مختلف علماء کرام کے تراجم ہمراہ ہوں۔ معری بھی ہوں۔ قدیم و جدید تفاسیر و لغات و شروح بھی ہوں، تاریخ و سیرت کی معتمد علیہ کتب بھی ہوں اور ریسرچ کے جدید ترین ذرائع بھی بروئے کار لائے جائیں تاکہ علمی روشنی پھیلے جہالت کے سائے نیست و نابود ہوں اور مخلوق خدا کی علمی پیاس بجھنے کا سامان ہو۔

نظامِ تعلیم: معنویت و مقصدیت کا فقدان اور اُس کا حل

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

ملک پاکستان میں نظام تعلیم کو بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل میں وہ امور بطور خاص قابلِ ذکر ہیں جن کا سامنا Micro Level (چھوٹی سطح) پر کلاس روم کے اندر اساتذہ اور طلبہ و طالبات کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان Micro Level کے مسائل کی طرف وہ تمام حلقہ جات متوجہ ہوں جو نظام تعلیم کی اصلاح کے ذمہ دار ہیں۔ زیر نظر تحریر میں اس حوالے سے چند سفارشات دی جارہی ہیں، جن پر عمل کر کے نظامِ تعلیم کا ہر ذمہ دار اپنی روزمرہ کی ذمہ داریوں کو بہتر بناتے ہوئے اس نظام کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں، چاہے وہ شہروں میں ہوں یا ملک کے دور دراز دیہی علاقوں میں ،وہاں ایک خاموش بحران پنپ رہا ہے۔ وہ بحران صرف عمارتوں، کتابوں، یا صرف Infrastructure (بنیادی ڈھانچے) کا نہیں ہے؛ وہ بحران ان تعلیمی اداروں تک جانے والی سڑکوں، کمروں اور عمارتوں کا بھی نہیں ہے؛ بلکہ وہ بحران معنوی بحران ہے۔ ہمارے نظام تعلیم کے بحران کا بنیادی سبب Meaningfulness (مقصدیت) کا فقدان ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو آج ہمارے نظام تعلیم سے Gradually (بتدریج) ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے پڑھنے اور پڑھانے کے معمول میں سے معنی اور مقصدیت مفقود ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے کلاس رومز آج Erosion of Meaning (معنی کی فرسودگی) کا مظہر بن چکے ہیں۔ نتیجتاً ان تعلیمی اداروں سے ایسی قوم

پیدا ہو رہی ہے جو پاکستان کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے موثر نہیں ہے۔ طلبہ کلاس رومز میں موجود تو ہیں، مگر ان میں جذبے اور Inspiration (ترغیب) کا فقدان ہے۔ اساتذہ روزمرہ کے تعلیمی بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور ان میں Sense of Vocation (پیشے سے لگاؤ کا احساس) کہیں کھو چکا ہے۔ کبھی تدریس ملک پاکستان میں ایک مقدس فریضہ و امانت سمجھی جاتی تھی، مگر آج اس کے برعکس ہے۔

اگر ہم مختلف تحقیقاتی رپورٹس کا جائزہ لیں تو Pakistan Bureau of Statistics کی 2024ء کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری شرح خواندگی تقریباً 62 فیصد ہے مگر 5 سے 16 سال کے درمیان عمر کے تقریباً 25 ملین بچے اس وقت اسکولز سے باہر ہیں۔ اس حوالے سے پاکستان پوری دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ لیکن صرف یہی المیہ نہیں ہے بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ جو اسکولز میں جا رہے ہیں، وہ کیا پڑھ رہے ہیں؟ وہ اڑھائی کروڑ بچے جو ان اسکولز سے دور ہیں، ان پر ہم تشویش کرتے ہیں، لیکن جو باقی دس کروڑ بچے ان اسکولز میں موجود ہیں، وہ ان اسکولز سے کیا بن کر نکلیں گے؟ مقامِ افسوس یہ ہے کہ یہ امر ہمارے لیے باعثِ تشویش نہیں ہے۔ میرے نزدیک سکولز سے باہر ان اڑھائی کروڑ بچوں سے زیادہ بڑی تشویش ان بچوں کے متعلق ہے جو ان اسکولز میں پڑھ رہے ہیں، مگر ہمیں معلوم ہی نہیں کہ وہ ان اسکولز سے پڑھنے کے بعد کیا بن کر نکلیں گے؟

نظامِ تعلیم کے بحران کے اسباب

ذیل میں ہم ان چند اسباب و وجوہات کا ذکر کر رہے ہیں، جن کی وجہ سے ہمارا نظامِ تعلیم بحران کا شکار ہے:

۱۔ تفکر و تدبر کا فقدان

ہمارے نظامِ تعلیم کی ناکامی کا ایک سبب یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کو Rote Memorization (رٹا لگا کر یاد کرنے) پر مرکوز کر دیا ہے اور اس کے اندر تفکری اور Reflective Thinking (غور و فکر پر مبنی سوچ) کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ اخلاقی تربیت کا اہتمام نہ ہونا

اخلاقی تربیت کا ہمارے نظامِ تعلیم سے نکل جانا ہمارے نظامِ تعلیم کے بحران کا دوسرا سبب ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کا اہتمام نہ ہونے کے سبب طلبہ کی اخلاقی حالت بتدریج تباہی کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے مگر افسوس کہ ہم اس کی طرف بھی متوجہ نہیں ہیں۔

۳۔اساتذہ اور طلبہ کے درمیان رشتۂ احترام کا فقدان

اساتذہ اور شاگرد کے درمیان تاریخ میں ہمیشہ احترام کا رشتہ موجود رہا ہے، مگر افسوس کہ آج یہ رشتہ غائب ہوتا جارہا ہے۔ یہ امر بھی ہمارے نظام تعلیم کی ناکامی کا ایک سبب ہے۔ کیا آج کا شاگرد واقعی استاد کا اتنا احترام کرتا ہے جو آج سے ایک نسل پہلے کیا جاتا تھا؟ وہ احترام کیوں غائب ہو گیا؟ میرے خیال میں یہ اساتذہ کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان احترام اور محبت کے رشتہ پر تو نظام تعلیم کی بنیاد قائم تھی۔ جب ہم نے اسے غائب کر دیا ہے اور اس محبت اور احترام کے رشتے کے بغیر تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں تو ذرا تصور کریں کہ ان اداروں سے کیا نسل پیدا ہو گی؟

کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے کہ ہم استاد اور شاگرد کے محبت اور احترام کے رشتے کے بغیر نظام تعلیم کو استوار کیے ہوئے ہیں؟ استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ پاکستان کی ثقافت میں جانا اور پہچانا جاتا تھا، بلکہ روایات میں تو اساتذہ کو والدین کا تسلسل مانا جاتا تھا۔ حضرت امام غزالی رضی اللہ تعالیٰ عنہ احیاء علوم الدین میں فرماتے ہیں: ”استاد وہ مالی ہے جو نوجوان دلوں کی باغبانی کرتا ہے“۔ کیا آج ہم استاد کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا آج کا استاد واقعی اس قابل ہے کہ وہ اپنے آپ کو نوجوان دلوں کا باغبان کہہ سکے؟ میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہے۔

استاد اور شاگرد کے اس رشتہ کے قطع ہونے کی وجوہات کے اوپر کئی تحقیقات ہیں، جن کی روشنی میں ان وجوہات کا علم ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان رشتۂ احترام کیوں زوال پذیر ہے۔ ذیل میں چند ایک وجوہات ذکر کی جارہی ہیں:

۱۔ ایک تحقیقاتی رپورٹ جو Teacher-Student Relationship (استاد شاگرد کا تعلق) پر 2024ء میں شائع ہوئی، اس میں ان مختلف شعبہ جات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں ایک اہم پہلو جس نے اس رشتے کو متاثر کیا، وہ سرکاری اور پرائیویٹ اسکولز کے اساتذہ کا تدریس کے دوران اختیار کیا گیا رویہ ہے، جو ان کی اپنی کہی ہوئی بات کے وزن کو گرا دیتا ہے۔ بچوں کو ہر بات ڈانٹ کر سمجھانا اور اگر وہ ایک سے زائد سوالات کر دیں تو ان کو ڈانٹ کر خاموش کروا دینا، اساتذہ اور طلبہ کے رشتہ کے درمیان ایک گہرا شگاف ڈالنے کے مترادف ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چھوٹے بچے ہیں، ان کو ڈانٹ کر خاموش کروایا جاسکتا ہے۔ ہاں، ڈانٹ کر خاموش تو کروا دیا جاتا ہے، لیکن ان کی نگاہ سے استاد کی عزت اسی لمحے ختم ہو جاتی ہے، جب اساتذہ ان کو کسی بات پر قائل نہیں کر پاتے، ان کو بات سمجھا کر فیصلہ نہیں کرتے بلکہ ڈانٹ کر کہتے ہیں: ”بس یہ حکم ہے“۔ اساتذہ نے خوف وہراس کا استعمال کر کے طلبہ کو خاموش تو کروا دیا لیکن ان کے دل ہار گئے۔

اب وہ دوبارہ جیتنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اس رپورٹ کے مطابق تقریباً 23 فیصد اساتذہ کی عزت صرف ان کے انتظامی رویوں کی وجہ سے بچوں کے دلوں میں کم ہوئی ہے۔

۲۔ 2018ء کی ایک رپورٹ کے مطابق کلاس رومز کے اندر نظم وضبط (Discipline) پر پوری طرح قدرت نہ رکھنا بھی ایک ایسا عمل ہے، جس کے سبب طلبہ کے دل میں اساتذہ کا احترام کم ہو جاتا ہے۔ جب بچے شکایات لے کر اساتذہ کے پاس آتے ہیں تو وہ حکمت اور محبت کے ساتھ ان کے مسائل کو حل نہیں کرتے یا پھر کچھ خاص طلبہ و طالبات کی طرف داری (Taking Sides) کرنے کا عمل بھی مجموعی طور پر طلبہ کو اساتذہ سے بد دل کر دیتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق گزشتہ سات سال میں اس سبب سے اساتذہ کی 42 فیصد عزت اور احترام بچوں کی نظروں میں گرا ہے۔ گویا یہ اساتذہ کی اپنی شخصیت کی کمزوری ہے، جس کی وجہ سے طلبہ و طالبات کی نگاہوں میں ان کا عزت و احترام کم ہوا ہے۔

۳۔ اسی طرح اساتذہ کا تدریس میں دلچسپی نہ لینا اور پڑھانے کے دوران ذہنی طور پر غیر حاضر رہنا بھی ایک سبب ہے کہ طلبہ کے دل میں ان اساتذہ کے عزت واحترام میں کمی آرہی ہے۔ اساتذہ کے اندر پیشہ ورانہ اطمینان موجود نہیں ہے۔ وہ ہر وقت بے چینی کا شکار رہتے ہیں اور مختلف روزگار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب وہ اپنا فریضہ انجام دینے کے لیے اپنے کلاس رومز میں داخل ہوتے ہیں تو صحیح طرح دلچسپی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے۔ نتیجتاً سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ وطالبات جو شعور رکھنے والی ایک نسل ہیں، وہ سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں ٹیچر کس لاپرواہی کے ساتھ ہمیں پڑھا رہے ہیں۔ اساتذہ کے اس عمل کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ان کا عزت اور احترام کم ہو جاتا ہے۔

۴۔ طلبہ کے دل میں اساتذہ کے عزت واحترام میں کمی کی ایک وجہ والدین کا اساتذہ کے بارے میں کلام اور اس سے روا رکھا گیا رویہ بھی ہے۔ جب والدین بچوں کے سامنے گھروں میں ان کے اساتذہ کو بد تہذیبی سے مخاطب کرتے ہیں، یا ان پر اظہارِ برہمی کرتے ہیں، یا ان کے حوالے سے طرح طرح کے کلمات بچوں کے سامنے بولتے ہیں تو نتیجہ بچوں کے دلوں میں اساتذہ کے احترام میں کمی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ تحقیقاتی رپورٹس کے مطابق بچوں کی نظروں میں اساتذہ کا 58 فیصد احترام والدین کے رویوں کی وجہ سے بھی کم ہوا ہے۔

۵۔ ثقافتی تبدیلی (Cultural Shift) بھی ایک ایسا سبب ہے جو اساتذہ اور طلبہ کے درمیان عزت واحترام کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ہمارے کلچر سے مجموعی طور پر احترام رخصت ہو گیا ہے۔ آج ڈیجیٹل دور ہے۔ سوشل میڈیا نے معلومات تو بہت پہنچائی ہیں

لیکن Authority کا تصور نوجوان نسل کی نگاہ سے ختم کر دیا ہے۔ اب ان کے لیے کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے مگر اتھارٹی کا تصور مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ طلبہ و طالبات کی زندگیوں سے ادب کی اہمیت مفقود ہو گئی ہے۔ ڈیجیٹل دنیا اور سوشل میڈیا ادب کے کلچر کو ختم کر رہا ہے۔ والدین بھی خود اسی بے ادبی کے معاشرے کی پیداوار بن رہے ہیں، نتیجتاً پھر ویسی ہی تربیت وہ بچوں کو بھی دیتے ہیں۔

۶۔ اساتذہ نصاب کو پڑھاتے ہوئے محنت سے کام نہیں لیتے۔ ذہین بچے سمجھ جاتے ہیں کہ استاد نالائق ہے۔ نتیجتاً دل میں وہ عزت اور احترام پیدا نہیں ہوتا۔ خوف کی وجہ سے کوئی زبان سے اگرچہ نہ کہے لیکن کوئی بھی شعور رکھنے والا یا محنت کرنے والا اور مطالعہ کرنے والا طالب علم ہو گا، اس کے دل سے ایسے استاد کی عزت ختم ہو جائے گی جو محنت کر کے طلبہ کے سامنے نہیں آیا اور جس نے اپنا مضمون پڑھانے کا حق ادا نہیں کیا۔

۷۔ بچوں کی عزت نفس کا خیال نہ رکھنا بھی طلبہ کے دلوں سے اساتذہ کی عزت کو کم کر دیتا ہے۔ دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھنا اگرچہ بچے ہی کیوں نہ ہوں، یہ اخلاقی تربیت کا حصہ ہے۔ اگر اساتذہ کرام کلاس میں بچوں کو "تم" اور "تو" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور انہیں "آپ" نہیں کہتے اور نہ ہی انھیں دوسروں کو بھی "آپ" کہہ کر بلانا سکھاتے ہیں، انھیں غیر معیاری زبان و الفاظ کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں اور انھیں بد تہذیبی سے ڈانٹتے ہیں تو بچوں کے دلوں میں اساتذہ کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔

یاد رکھیں ! مذکورہ امور بہت حساس شعبہ جات (Sensitive Areas) ہیں۔ یہ Independent Elements نہیں ہیں کہ اگر ایک عنصر کو متاثر کر دیں گے تو اس کا فرق دوسری جانب نہیں پڑے گا۔ نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ساری چیزیں باہم جڑی ہوئی (Connected) ہیں اور یہ سارے Elements مل کر اقوام بناتے ہیں یا انھیں تباہ کرتے ہیں۔ جب ہم ان میں سے کسی ایک عنصر کو بھی متاثر کرتے ہیں یا تباہ کر دیتے ہیں تو اس کا یقیناً اثر دوسری جانب کہیں نہ کہیں پڑتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے منتظمین، حکمران اور ذمہ داران جب اس طرح کا شعور اور فہم نہیں رکھتے اور اثرات (Implications) کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر فیصلے کرتے چلے جاتے ہیں تو اس رویے اور طرزِ عمل سے اقوام تباہ ہوتی ہیں مگر تعمیر و ترقی کی منازل کبھی طے نہیں ہو سکتیں۔

۴۔ معنویت کا فقدان

ہمارے نظامِ تعلیم میں معنویت کا فقدان (Meaninglessness) اس کے بحران میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ اساتذہ جانتے ہی نہیں کہ وہ جو کچھ پڑھا رہے ہیں، یہ کیوں کر رہے ہیں؟ ان کی ہر روز کی کلاس کا مقصد کیا ہے؟ اس سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟ وہ تعلیمی نظام اور پڑھائی جس سے ہم جڑے ہوئے ہیں، کیا اس کا مقصد صرف ڈگریز (Degrees) حاصل کرنا ہے یا اس سے کچھ اور بھی مراد ہے؟ یہ معنویت کہیں کھو چکی ہے اور اس کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ایک پوری نسل تعلیمی اداروں سے بھی بیزار ہو گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ملازمت کرنی ہے تو ہم Short Courses کریں، آن لائن سیکھنے کے پروگرامز (E-Learning Programs) کا حصہ بنیں، Certificates حاصل کریں اور براہ راست جا کر ملازمت کریں۔ ہم خواہ مخواہ کیوں اپنے کئی سال ڈگری کے حصول کے لئے کالجز اور یونیورسٹیز میں ضائع کرتے ہیں۔

یہ سوچ اس لئے طلبہ کے اندر پیدا ہوئی کہ ہم نے اداروں کو صرف ڈگری بانٹنے کی مشین بنا دیا ہے۔ ہم نے تعلیم کی معنویت ختم کر دی۔ یہ تعلیمی ادارے دراصل شخصیت سازی کے ادارے ہیں لیکن اگر یہاں سے شخصیت سازی کا تصور ہی ختم ہو جائے اور صرف ڈگریز ملیں اور ان ڈگریز کے باوجود بھی ملازمت نہ ملے تو پھر طالب علم کہتا ہے کہ میں براہ راست ایسے Technical Courses اور سرٹیفکیٹس کیوں نہ کر لوں جس سے مجھے ملازمت آسانی سے مل جائے گی اور میرا روزگار بہتر ہو جائے گا۔ اداروں کا طلبہ کی شخصیت سازی میں کردار ادا نہ کرنا، اس نظام تعلیم میں معنویت اور بے مقصدیت کو فروغ دے رہا ہے۔ معنویت اور مقصدیت کا فقدان (Meaninglessness) اساتذہ اور طلبہ دونوں میں اضطراب (Anxieties) اور افسردگی (Depression) پیدا کرنے کا باعث بھی ہے۔

معنویت اور مقصدیت (Meaningfulness) درحقیقت ایک پائیدار مقصد یا اخلاقی رہنمائی ہے جو انسان کی زندگی کو سمت فراہم کرتی ہے۔ انسان کے اندر جو Existential Emptiness (وجودی خالی پن) پیدا ہو جاتا ہے، درحقیقت مقصدیت اس کا علاج ہے یعنی زندگی کو کوئی نہ کوئی مقصد فراہم کرنا۔ اساتذہ کیوں پڑھا رہے ہیں اور وہ اس مقدس پیشہ سے کیوں منسلک ہیں؟ طلبہ کیوں علم حاصل کر رہے ہیں؟ کیا اساتذہ صرف تنخواہ کے لیے اور طلبہ صرف ڈگری حاصل کرنے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی مقصد نہیں ہے

اور یہ سب کچھ ایک بیکار سرگرمی ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسا رجحان اور طرزِ عمل ہے کہ جس کی طرف ہمیں متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے تمام اعمال (Activities) کی بنیاد نیت کو قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی

اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

یاد رکھیں! نیت ہی مقصدیت کا دروازہ ہے کہ انسان جو عمل کر رہا ہے، اس کی نیت کیا ہے؟ بطور استاد اس کی نیت کیا ہے اور بطورِ شاگرد اس کی نیت کیا ہے؟ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں طلبہ اور اساتذہ اپنا Why (مقصد) کھو بیٹھے ہیں۔ وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، مگر وہ یہ سارا عمل "کیوں" کرتے ہیں، اس کا ان کے پاس جواب نہیں ہے۔ اگر ان سے ان کا مقصد پوچھا جائے تو ویسے ہی کوئی سیاسی بیان دے دیتے ہوں گے لیکن حقیقت میں ان کے دل کے پاس شاید اس کا جواب نہ ہو کہ وہ یہ کیوں کر رہے ہیں۔ یہ ایک Existential Emptiness (وجودی خلا) ہے جو درحقیقت ان کو گھیرے ہوئے ہے اور جس نے ان کا مقصد گم کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صدیوں پہلے اس کی نشان دہی فرما دی تھی کہ یہ مقصد گم جائے گا۔ ارشاد فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔

"سو کیا تم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار (وبے مقصد) پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟۔" (المومنون، ۲۳: ۱۱۵)

ضرورت اس امر کی ہم اپنے نظامِ تعلیم، اساتذہ، طلبہ، نصاب، تعلیمی ماحول کے تناظر میں اس مقصد کو تلاش کریں جسے ہم گم کر چکے ہیں۔

اگر نظامِ تعلیم میں مقصدیت کا عنصر شامل کر لیا جائے تو یہ اساتذہ و طلبہ پر بہت مثبت اثرات مرتب کرے گا۔ اس حوالے سے بین الاقوامی سطح پر شائع ہونے والی Academic Reports کا خلاصہ یہ ہے کہ جو طلبہ مقصدیت اور معنویت کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں تو باقی طلبہ کے مقابلے میں ان کی کارکردگی 30 فیصد زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ یعنی اگر طالب علم مقصدیت سے سرشار ہو اور معنویت اس کے ساتھ وابستہ ہو تو وہ 30 فیصد بہتر نتائج حاصل کرتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر طلبہ و طالبات اور اساتذہ کے ساتھ معنویت وابستہ ہو جائے تو ان میں اضطراب بھی ختم ہو جاتا ہے۔ Harvard Medical School کے ایک سروے Neuroimaging Studies کے مطابق جب اساتذہ پڑھاتے ہوئے

معنویت کھو بیٹھتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ یہ کام وہ کیوں کر رہے ہیں تو اس کام کی انجام دہی کے دوران وہ افسردگی، اضطراب اور Behavioral Issues کا شکار ہوتے ہیں۔ نتیجتاً کلاس میں طلبہ کو جھڑکنا، غصے کا اظہار کرنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ان کا معمول بن جاتا ہے۔

اگر ہم معنویت و مقصدیت کے سے خالی افراد کو استاد کے منصب پر فائز کر دیتے ہیں تو گویا ہم نے طلبہ کے اوپر ایک مریض مقرر کر دیا ہے جو اپنے اس رویہ کے باعث بچوں کا مستقبل برباد کر رہا ہے۔ مقتدر حلقوں اور والدین کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم نے اپنے بچوں کو روز ایک مریض کے آگے چھوڑ کے آتے ہیں کہ وہ ان کی شخصیت کو تباہ کر کے انھیں ہر روز اڑھائی تین بجے ہمیں واپس کر دے۔ اسکول کی انتظامیہ ہو، یا کسی تعلیمی نظام کے ذمہ دار یا حکومت، کسی کے پاس کوئی Mechanism نہیں ہے کہ وہ Assessment کر سکیں کہ ہماری نسل مریضوں کے آگے بیٹھی ہے یا صحت مند افراد ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سرانجام دے رہے ہیں۔

جب استاد میں معنویت کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے تو وہ شدید تھکن محسوس کرنے لگ جاتا ہے اور اس کے اندر Motivation نہیں رہتی۔ اب وہ جب بھی بچہ سے مخاطب ہو گا تو اسے جھڑکے گا، ڈانٹے گا، غصے سے جواب دے گا اور Reactionary Approach کے ساتھ سلوک کرے گا، الفاظ اور زبان کا استعمال درست نہیں ہو گا تو نتیجتاً بچے بھی اس سے یہی کچھ سیکھیں گے۔ لہذا اسکولز پرنسپلز اور انتظامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ یقینی بنائیں کہ کلاس روم کے اندر موجود استاد صحت مند ہو، اعصاب کا مضبوط ہو اور اس کا اضطراب اور افسردگی سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کے اعصاب تباہ نہ کر رہی ہو۔ اس لئے کہ بچوں کا معاملہ بہت حساس ہوتا ہے۔ اس جانب متوجہ نہ ہونے کے سبب ہم بچوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار اساتذہ کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اور والدین بھی ہیں۔

معنویت و مقصدیت کے جسمانی فوائد

سائنسی تحقیقات بتاتی ہیں کہ معنویت (Meaningfulness) صرف انسان کے اندر جذباتی و شعوری استحکام اور Motivation ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ زندگی میں معنویت اور مقصدیت کا ہونا جسمانی صحت کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی کے ایک سروے کے مطابق جو لوگ معنویت و مقصدیت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں یا کسی بھی شعبے میں کام کرتے ہیں، وہ بقیہ افراد کے مقابلے میں زیادہ عمر پاتے ہیں۔ اس لئے کہ جن کی زندگی سے جینے کا مقصد چلا جاتا ہے، وہ پھر جو بھی عمل کرتے ہیں، ان کے ہاں اس عمل کی کوئی معنویت نہیں ہوتی۔ ان کی Motivation to Live بھی چلی جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ افسردگی اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی پرواہ (Care) بھی نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں کیونکہ ان کے پاس جینے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ بیماریوں میں گھرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کی عمر مختصر ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو ایک مقصد کے لیے جیتے ہیں، وہ اپنی صحت کا خیال بھی رکھتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقصد ہے جس کی انہوں نے تکمیل کرنی ہے۔ وہ Focused رہتے ہیں اور سائنسی طور پر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر بھی بڑھا دیتا ہے۔ پس اگر معنویت و مقصدیت نصیب ہو جائے تو پھر وہاں پر جذباتی استحکام بھی نصیب ہوتا ہے، شعور بھی پروان چڑھتا ہے، حوصلہ بھی نصیب ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی صحت بھی بہتر ہوتی ہے اور اللہ بھی راضی ہوتا ہے۔

۵۔ اساتذہ کی تقرری کے لئے کسی پیمانہ کا نہ ہونا

ہم بہت سارے شعبہ جات میں تقرری (Appointment) کرنے سے پہلے لوگوں کی ذہنی صلاحیت، ان کا IQ Level (ذہانت کی سطح)، ان کا صبر (Patience) کا امتحان لیتے ہیں۔ کیا ہم نے اساتذہ کی تقرری کے لئے بھی اس طرح کا کوئی امتحان رکھا ہے؟ ایسا نہ کرنا بھی ہمارے نظام تعلیم کو ایک بحرانی کیفیت سے دوچار کیے ہوئے ہے۔

ہمیں شعور ہی نہیں ہے کہ بچے قوم کا مستقبل ہیں۔ یہ اصل میں قوم کی وہ فصل ہے جس نے اس ملک کو سرسبز کرنا ہے۔ اس فصل کی حفاظت، اسے سجانے اور سنوارنے کی ذمہ داری اساتذہ کی ہے۔ لہذا ان اساتذہ کی تربیت اور اس حوالے سے ان کی جانچ پڑتال اشد ضروری ہے تاکہ یہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ احسن طریق پر انجام دے سکیں۔

اساتذہ کی تربیت (Training) کا ایک موثر نظام سنگاپور حکومت نے متعارف (Introduce) کروایا ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی Monitoring کی کہ وہ ذہنی طور پر کتنے صحت مند ہیں؟ اس حوالے سے انھوں نے اپنے اساتذہ کو ایک امتحان سے گزارا، جس کے نتیجہ میں اساتذہ کے اضطراب میں 45 فیصد کمی واقع ہوئی، یعنی ان کی کارکردگی (Performance) میں پہلے کی نسبت 45 فیصد بہتری ہوئی۔

ہمارے ہاں تو اساتذہ (خواتین و حضرات) اپنے گھروں میں ہونے والے جھگڑوں، جھنجھلاہٹ اور الجھنوں کا بھی سارا غصہ اپنے سامنے بیٹھے ان معصوم بچوں پر نکالتے ہیں جو ان سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے آئے ہیں۔ ایسا کرنا ایک قابلِ گرفت عمل ہے اور بندہ اللہ رب العزت کے حضور اس کا جوابدہ ہے۔ اس لئے کہ اگر تدریس کو بطورِ پیشہ منتخب کر ہی لیا ہے تو اس کے ساتھ انصاف کریں۔ انسان اپنے اچھے بُرے کام کا اللہ کو جواب دہ ہے۔ ایک قوم کے مستقبل کو سنوارنا بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے جسے ہم سب سے آسان ملازمت سمجھتے ہیں کہ کوئی کام نہیں ملا تو اسکول میں استاد لگ گئے۔

یاد رکھیں! یہ بہت زیادہ جوابدہی والا کام ہے، اس لئے انسان دیگر سو کام کرلے مگر تدریس کو بطورِ پیشہ اختیار کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچے۔ اس لئے کہ پھر اس کے ساتھ سیکڑوں لوگوں کے مستقبل جڑ جائیں گے اور ہر ایک کا جواب اللہ رب العزت کے حضور اسے دینا ہوگا۔ پہلے وہ شخص فقط اپنا ذمہ دار تھا اور اپنی ذات کا جواب دہ تھا، اب وہ ہر اس بچے کے مستقبل کا بھی جواب دہ بن جائے گا کہ جو اس سے وابستہ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس زندگی کو "حیاۃً طیبہ" کہا، درحقیقت مقصدیت و معنویت کے حصول کے بعد استاد ایسی زندگی کے مصداق بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی دنیا بھی Emotional Management کے ذریعے اچھی کر دیتا ہے اور پھر ایسے اساتذہ کے سامنے بیٹھے ہوئے بچے بھی انہیں عزت دیتے ہیں اور وہ اپنی ذمہ داری کو بھی بہتر انداز میں انجام دیتے ہیں۔ پھر انھیں ایک Self-Satisfaction ملتی ہے کہ ان کے پڑھائے ہوئے بچے ملک و ملت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ وہ انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اللہ بھی ان سے راضی ہوتا ہے کہ انہوں نے بندگی کا حق ادا کیا ہے۔ گویا اس زندگی اور اپنے پیشہ میں معنویت و مقصدیت کو اپنانے کے بعد ان کی زندگی بھی طوالت اختیار کر جاتی ہے اور وہ اچھی صحت کے ساتھ بھی جیتے ہیں۔ یعنی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھنے سے اللہ تعالیٰ ان کی زندگی سنوار دیتا ہے۔

انسانی زندگی اور وقت کی قدر واہمیت

ڈاکٹر نعیم انور نعمانی

انسانی زندگی میں وقت کی قدر وقیمت اور اہمیت وضرورت سے کوئی ذی شعور شخص انکار نہیں کر سکتا۔ وقت کی قدر ایک مسلمان کے مذہبی فرائض میں سے ہے۔ جو مسلمان وقت کی قدر نہیں کرتا، وہ اپنا مذہبی فریضہ ہی ادا نہیں کر سکتا۔ قرآن نے زمانے، دن اور رات اور اوقات کی قسمیں کھائی ہیں۔ ان ساری قسموں کا مقصد انسان کو پکار پکار کر وقت کی قدر واہمیت اور اس کی فضیلت وافادیت کی طرف متوجہ کرنا ہے اور عمرِ عزیز کی گزرتی ہوئی ان موجوں اور لہروں سے نفع اٹھانے کی ترغیب دینا ہے اور اپنی زندگی کے پل پل کو تول کر صرف کرنے کی اہمیت اذہان میں راسخ کرنا ہے۔

باری تعالیٰ نے احکام شریعت کو وقت کے ساتھ متعلق رکھا ہے۔ ہر حکمِ شرعی کی ادائیگی کے لیے ایک خاص وقت مختص ہے جس کی ابتداء کا بھی تعین ہے اور انتہا کا بھی تعین ہے۔ نماز کی ادائیگی کا عمل ہر مسلمان کو روزانہ وقت کی پابندی کا سبق سکھاتا ہے۔ ہر نماز ایک مقررہ وقت پر ادا کی جاسکتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔

”بے شک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے حساب سے فرض ہے۔“ (النساء، ۴: ۱۰۳)

اگر وہ مقررہ وقت نکل جائے تو انسان کا عمل صلوۃ ادا نہیں بلکہ قضا ٹھہرتا ہے۔ نماز کی ہیت اور ادائیگی کی صورت میں کوئی فرق نہیں آتا مگر اس کے باوجود مقررہ وقت میں ادا نہ کی گئی نماز ادا نہیں بلکہ

قضا بن جاتی ہے۔ روزے اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے ماہ میں فرض کیے ہیں۔ اگر سال بھر روزے رکھے جائیں مگر اس ماہ میں روزے نہ رکھے جائیں تو وہ روزے نفلی روزے ہوں گے، رمضان المبارک کے روزے ہر گز نہیں ہو سکتے۔ حتی کہ اس فرض کی ادائیگی کا وقت گزر جانے کے بعد ساری عمر کے روزے بھی ان کی ادا نہیں بن سکتے۔ جو وقت گذرا، سو وہ گذر گیا، اب وہ واپس نہیں آسکتا۔

سال میں سے حج کا وقت باری تعالیٰ نے ذوی الحج میں مختص کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی ذوی الحجہ کے مخصوص ایام حج میں حاضر نہیں ہوتا اور مناسکِ حج ادا نہیں کرتا تو بعد ازاں اگرچہ وہ سارا وقت بیت اللہ کے پاس بھی گزار دے، اس کا حج نہیں ہوگا، سارا سال میدان عرفات میں آتا جاتا رہے اور ہر روز حاضر رہے مگر یوم عرفہ حاضر نہ ہونے کے سبب اس کا حج نہیں ہوگا۔

ایک مسلمان کو ہر ہر لحظہ کائنات کا ذرہ ذرہ وقت کی اہمیت کا احساس دلا رہا ہے۔ لیل و نہار کی گردش، سورج کا طلوع و غروب، موسموں کا تغیر و تبدل، ہماری زندگی کی صبح و شام، ہمارا بچپن و لڑکپن، ہماری نوجوانی و جوانی، ہمارا بڑھاپا و ضعف یہ تمام وقت ہی کی علامات ہیں۔ ہماری زندگی کا کل وقت در حقیقت لیل و نہار ہے۔ اس لیے قرآن بیان کرتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ (الفرقان، ۲۵: ۶۲)

"اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے گردش کرنے والا بنایا اس کے لیے جو غور و فکر کرنا چاہے یا شکر گزاری کا ارادہ کرے (ان تخلیقی قدرتوں میں نصیحت و ہدایت ہے)۔"

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو پانچ چیزوں کی قدر و اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اغتنم خمسا قبل خمس: شبابك قبل هرمك وصحتك قبل سقمك وغناك قبل فقرك وفراغك قبل شغلك۔

(مشکوۃ المصابیح، کتاب الرقاق)

"پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت سمجھو: موت سے پہلے حیات کو، بیماری سے پہلے تندرستی کو، مصروفیت و مشغولیت سے پہلے فراغت و فرصت کو، بڑھاپے و ضعف سے پہلے جوانی کو اور فقر و تنگدستی سے پہلے مالداری کو۔"

یہ پانچ چیزیں انسان کو وقت کی اہمیت بتا رہی ہیں۔ زندگی ایک بہت قیمتی وقت ہے، اس وقت کو بہت عمدگی اور صالحیت کے ساتھ استعمال کیا جائے تاکہ جب وقتِ موت آئے تو یہ حیات ندامت نہ بن جائے۔ آج کی صحت و تندرستی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اس لیے صحت و تندرستی میں انسان اپنے وقت کا صحیح استعمال کرے۔ قبل اس کے کوئی بیماری حملہ آور ہو جائے اور وہ انسان کا وقت لے جائے۔

انسان کے پاس لمحاتِ فرصت و فراغت کم ہیں اور مصروفیات و مشغولیات زیادہ ہیں۔ اپنے وقتِ فرصت کو اپنی مشغولیت کا سبب بنایا جائے تاکہ کل مصروفیات کے ہجوم میں کچھ بوجھ کم ہو سکے۔ نوجوانی و جوانی بڑھاپے کے مقابلے میں ایک بہت بڑی نعمت خداوندی ہے۔ اس جوانی میں زیادہ سے زیادہ اعمال کا بوجھ اٹھالینا چاہیے۔ کل بڑھاپا خود ایک بوجھ بن جائے گا اور یہ مزید بوجھ اٹھانے کا متحمل نہ ہوگا۔ آج اللہ رب العزت نے جو مال و دولت دیا ہے، اس کا صحیح اور موزوں مصرف تلاش کیا جائے۔ اس لیے کہ مال کا اسراف و تبذیر فقر میں مبتلا کرنے والا ہے۔ یہ پانچوں حالتیں انسان کے وقت کی حالتیں ہیں۔

صحت و فراغت ایک عظیم نعمت ہیں

جو شخص وقت کے ہر لمحے اور ہر پل کو تول کر اور سوچ کر گزارتا ہے، وہی کامیاب و کامران ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحت اور فراغت کو ایک نعمت عظیم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

نعمتان مبغبون فیهما کثیر من الناس الصحة والفراغ۔ (سنن ترمذی، کتاب الزہد عن رسول اللہ ﷺ)

”دو نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکے کا شکار ہیں، ایک صحت اور دوسری فراغت۔“

ہم اپنی صحت کی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں۔ صحت میں اپنے جسم کی توانائیوں کا مثبت استعمال نہیں کرتے۔ اپنی جسمانی سرگرمیوں کو مفید نہیں بناتے۔ صحت میں بھی ہم اسراف کا عمل کرتے ہیں اور صحت کی بری طرح ناقدری کرتے ہیں اور حقیقت میں یہی صحت ہماری ذات کی قدر میں اضافہ کرنے والی تھی۔ اچانک بیماری کا حملہ ہوتا ہے اور صحت کی نعمت لٹ جاتی ہے۔ اب مرض سے لڑ لڑ کر صحت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے آج اگر صحت ہے تو اس پر اللہ کی بارگاہ میں شکر گزار ہو جائیں اور اس کی شکر گزاری والے اعمال بجالائیں اور اپنی ذات کی کامیابی والے افعال خوب سے خوب سرانجام دیں تاکہ کل بیماری میں صحت کی نعمت کے جانے کا پچھتاوا نہ ہو۔

فراغت کی نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ اس فراغت کو مشغولیت میں بدل دیا جائے۔ ایک مسلمان کی زندگی میں مصروفیت و مشغولیت کے بغیر حیات کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ ایک مسلمان ہر وقت یا حقوق اللہ کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور وقت کی اہمیت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ میں ہر وقت خود کو مستعد رکھتے

اور اللہ سے یہ دعا کرتے کہ مولا میری جسمانی و روحانی قوتوں پر غفلت کا حملہ نہ ہو۔۔۔ غفلت میرے اندر اطاعت کے جذبے کو کمزور نہ کرے۔۔۔ اور تیری اطاعت کے سبب میری غفلت تیری پکڑ اور گرفت کا باعث نہ بنے۔ فرماتے:

اللھم لا تدعنا فی غمرۃ ولا تاخذنا علی غرۃ ولا تجعلنا من الغافلین۔ (ڈاکٹر عبدالستار نویر، الوقت ھوالحیاۃ، ص ۱۷)

"اے اللہ ہمیں شدت میں نہ چھوڑ اور ہمیں غفلت میں نہ پکڑ اور ہمیں غفلت کرنے والوں میں سے نہ بنا۔"

مزید برآں فرماتے تھے زمانے کی گردش ایک عجیب معاملہ ہے لیکن انسان کی غفلت اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اس انسان کو اپنی عمر اور اپنی زندگی کی ان ساعتوں پر آنسو بہانے چاہئیں جو بغیر اطاعت کے گذر گئیں اور بندہ اللہ کی اطاعت اور عبادت نہ کر سکا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور وقت میں برکت کی دعا

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں وقت کی ہر ساعت میں برکت کی دعائیں کرتے:

اللھم انا نسئلك صلاح الساعات والبركة فی الاوقات۔

(ڈاکٹر عبدالستار نویر، الوقت ھوالحیاۃ، ص ۱۸)

"اے اللہ ہم تجھ سے زندگی کی ساعتوں کی بہتری اور اپنی زندگی کے اوقات کی برکت مانگتے ہیں۔"

وقت تو ہر کسی کا گزرتا ہے مگر سوال یہ ہے کس کا وقت کس طرح اور کیسے گزرتا ہے۔۔۔؟ کون اپنے وقت میں بنتا ہے اور کون اپنے وقت میں بگڑتا ہے۔۔۔؟ کس کا وقت اس کی ذات کو نفع دیتا ہے اور کون سا وقت اس کی ذات کو نقصان و خسارہ دیتا ہے۔۔۔؟ کس کی زندگی کا وقت نفع میں گزر رہا ہے اور کس کی زندگی کا وقت نقصان اور خسارہ میں گزر رہا ہے۔۔۔؟ کون انسان، ان الانسان لفی خسر کا پیکر بنا ہوا ہے اور خود ہی کو نقصان پہنچا رہا ہے۔۔۔؟ ہم اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں آتے ہیں تو ہم اپنے اوپر اس وقت کا عائد کردہ فرض ادا کرتے ہیں تو اس فرض کی ادائیگی کے ساتھ ہم رب سے برکت مانگنے آتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی صحت کی نعمت مانگنے آتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی کامیابی مانگنے آتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی ضرورت کی کفالت مانگنے آتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی شدید حاجت کی تکمیل کے لیے رب کے حضور آتے ہیں۔۔۔ ہم خود کو خدا سے مانگنے آتے ہیں۔۔۔ ہم اپنی ذات کی معرفت مانگنے آتے ہیں۔۔۔ حتی کہ ہم خدا سے خدا کو مانگنے آتے ہیں۔۔۔ یہی مانگنے کا وقت ہی ہماری زندگی کا بہترین وقت بن جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وقت ہی حیات ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی زندگی کو اپنی کتاب زیست قرار دیتے کہ اس میں موجود دن کی حیثیت میری کتابِ حیات کے صفحات کی سی ہے۔ فرماتے کہ میں اپنی کتابِ زیست کے صفحات اعمالِ صالحات سے معمور کرنے کی سعی ہر روز کرتا ہوں اور یہی چاہتا ہوں کہ میری کتاب زندگی کا ہر ہر صفحہ اپنے اندر بے پناہ اعمالِ صالحہ اور اعمالِ خیر لیے ہو۔ فرماتے ہیں:

الایام صحائف اعمالکم فخلدوھا صالح اعمالکم۔

''یہ ایام تمہاری عمروں کے صحیفے ہیں اچھے اعمال سے ان کو دوام بخشو۔'' (عبدالفتاح ابوغدہ، قیمۃ الزمن عند العلماء، ص ۱۵)

عملِ مسلسل حیاتِ مسلسل ہے

انسان کو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا چاہیے۔ یہی انسان کے وقت کا بہترین استعمال ہے، کبھی اور کسی وقت وہ فارغ نہ ہو۔ ہر چیز کو ایک مقصد کے ساتھ کرے۔ اپنے عمل کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ مستقل اور مسلسل کی صفت عملِ قلیل کو بھی عمل کثیر بنا دیتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو کامیابی و کامرانی کا راز بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

احب الاعمال الی اللہ ادومھا وان قل۔

(صحیح مسلم، باب فضیلۃ العمل الدائم۔۔۔)

''اللہ کو وہ عمل محبوب ہے جو دائمی ہو اگرچہ مقدار میں کم ہو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اس دن سے زیادہ کسی چیز پر نادم نہیں ہوتا جو میری عمر سے کم ہو جائے اور اس میں میرے عمل میں اضافہ نہ ہو سکے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے نزدیک وقت کی اہمیت

ہماری یہ زندگی اعمال صالحہ بڑھانے کا وقت ہے۔ ہماری زیست کا یہ وقت اپنی دنیوی اور اخروی نجات کے حصول کا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرماتے کہ دن رات کی گردش آپ کی عمر کو کم کر رہی ہے تو پھر آپ اپنے عمل میں سست کیوں ہیں۔

(شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، قیمۃ الزمن عند العلماء، ص ۲۵)

گویا وقت کا گزرنا، عمل کا گزرنا ہے۔ انسان کے وقتِ زیست میں سب سے قیمتی چیز یہ ہے کہ اس وقت کو عمل سے بھرپور اور معمور کر دیا جائے۔ وقت کے کسی حصہ کو بھی عمل کے بغیر نہ رہنے دیا جائے۔ ایک مرتبہ کسی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ یہ کام کل تک کے لیے موخر کر دیجئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میں ایک دن کا کام مشکل سے مکمل کرتا ہوں اور اگر آج کا کام بھی کل پر چھوڑ دوں گا تو میرے ذمہ دو دن کا کام ہو جائے گا تو پھر بعد ازاں میں دو دن کا کام کیسے کروں گا۔ (شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، قیمۃ الزمن عند العلماء، ص ۲۶)

وقت میں عذرِ کل، قتلِ وقت ہے

آج کے کام کو کل کا کام بنانا ایک دھوکہ ہے۔ ہمیشہ کل کی عادت بچوں کا بہلاوا ہے کہ فلاں کھلونا تمھیں کل لے کر دیا جائے گا۔ کل پر کام چھوڑنا، غفلت اور غیر ذمہ داری کی نشانی ہے۔ ہماری زندگیوں سے آج کا وقت مرنا نہیں چاہیے اور نہ ہماری زندگیوں سے لفظ آج مرنا چاہیے۔ ہمارا آج ہی ہمارا کل ہے اور ہمارے آنے والا کل بھی آج ہے۔ اس لیے اقبال نے کہا:

فقط امروز ہے تیرا زمانہ

ہم آج کے بوجھ کو کل پر نہ لادیں، اس لیے کہ خود کل اپنے بوجھ اور اپنی ذمہ داری کے ساتھ ہماری زندگیوں میں طلوع ہونے والا ہے۔ کل کی رٹ انسان کی زندگی کو خال بنا دیتی ہے جبکہ انسان کی کامیابی اعمال میں ہے۔ عمل ہی انسان کے وقت کا بہترین استعمال ہے۔ کامیاب لوگ وہ ہیں جو اپنے آج کو کل نہ بنائیں بلکہ اپنے آنے والے کل کو بھی آج بنا دیں۔ کسی نے کیا خوب کہا:

ہر شبی گویم کہ فردا ترک این سودا کنم
باز چون فردا شود، امروز را فردا کنم

ہر شب میں کہتا ہوں کہ کل میں اس سودا (عشق) کو ترک کر دوں گا، پھر جب فردا (کل) آجاتی ہے تو میں (امروز) آج کو (فردا) کر دیتا ہوں۔

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور وقت کی اہمیت

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وقت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمہاری زندگی کے ایام ہی تمھارا وقت ہیں۔ تیرے لیے کسی دن کا خالی جانا اور عمل کے بغیر گزرنا اور مقصدِ حیات سے بے

پرواہ بسر ہونا ہی تیرے وقت کا ضائع ہونا ہے۔ تیرے یوم کا ضائع ہونا تیرے وقت کا ضائع ہونا ہے، تیرے ایام کا ضائع ہونا تیری زندگی کے اوقات کا ضائع ہونا ہے۔ فرماتے ہیں:

یا ابن ادم انما انت ایام فاذا ذھب یوم ذھب بعضك۔

(ڈاکٹر عبدالستار نویر، الوقت ھوالحیاۃ، ص ۲۹)

اے ابن آدم! تو ایام ہی کا مجموعہ ہے۔ جب ایک دن گزر جائے تو یوں سمجھ کہ تیری زندگی کا ایک حصہ بھی گزر گیا۔

مزید برآں فرماتے ہیں میں نے ایسی اقوام کو دیکھا ہے جن کے ہاں وقت کی اہمیت اور قدر و قیمت تمہارے پاس موجود دراہم و دنانیر کی محبت سے بھی کہیں زیادہ تھی۔

امام ابن جوزیؒ اور وقت کی اہمیت

چھٹی صدی ہجری کے ایک معروف عالم امام بن الجوزیؒ اپنے بیٹے کو وقت کی قدر و اہمیت اور زندگی کی نعمت کی قدر دانی کی نصیحت و تعلیم ہوئے فرماتے ہیں:

وانظر کل ساعۃ من ساعاتك بما ذا تذھب۔

اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کر کہ اور اس بات کا اندازہ کر تیری زندگی کا ایک ایک لمحہ کس عمل میں گزر رہا ہے اور کیسے گزر رہا ہے؟ گویا اپنے زندگی کے وقت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ زندگی کے ایک ایک سانس کو بھی کسی عمل میں گزاریں۔ مزید فرماتے ہیں:

ولاتھمل نفسك

کسی بھی لمحہ حیات میں خود کو بیکار نہ رہنے دو۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی کام کرتے رہو اور طبیعت کو ایسا بناؤ کہ:

وعودھا اشرف مایکون من العمل واحسنہ

(ڈاکٹر عبدالستار نویر، الوقت ھوالحیاۃ، ص ۳۵)

ہر لمحہ ایک بہترین، افضل، احسن، اشرف اور اعلیٰ عمل تمہارے وجود سے ہر سانس کے بدلے میں جاری ہو۔ تمہاری ذات احسن، ارفع اور اعلیٰ عمل کی پہچان بن جائے۔ اگر تیری زندگی کی ساعتیں ایسی ہو جائیں تو گویا تو نے اپنی زندگی کے وقت کا صحیح استعمال کیا ہے۔

خلاصۂ کلام

وقت انسان کے پاس ایک سرمایہ حیات ہے جو ہر شخص کو قدرت نے یکساں عطا کیا ہے۔ جو لوگ اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں، وہی زندگی میں کامیابی و سرفرازی پاتے ہیں۔ وقت کا صحیح استعمال ہی ایک

وحشی انسان کو مہذب انسان، ایک جاہل کو عالم، ایک مفلس کو تونگر ایک نادان کو دانا، ایک غریب کو امیر اور ایک گدا کو شاہ بناتا ہے۔ انسانی زندگی میں علم و کمال کسبی چیزیں ہیں، یہ کسی قوم یا فرد کی میراث نہیں۔ جو لوگ بھی وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور محنت و مشقت کرتے ہیں، وہی کامیاب و سرفراز ہوتے ہیں۔ جو اقوام وقت کی قدر کرنا جانتی ہیں، وہی صحراؤں کو گلشن میں بدل دیتی ہیں، وہ فضاؤں پر قبضہ کر سکتی ہیں، وہ عناصر کو مسخر کر سکتی ہیں، وہ پہاڑوں کے جگر پاش پاش کر سکتی ہیں، وہ ستاروں پر کمندیں ڈال سکتی ہیں اور وہ زمانے کی زمامِ قیادت سنبھال سکتی ہیں۔

اس کے برعکس جو اقوام وقت کو ضائع کرتی ہیں وقت ان کو ضائع کر دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی کاوشوں کے میدان کو بھی تبدیل کرنا پڑتا ہے مگر بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم ہر میدانِ کاوش میں ہمارا وقت بہترین گزر رہا ہو۔ ہمارے وقت کا بہترین مصرف ہر لمحہ بڑھتا چلا جائے۔ وقت انسان کے پاس درحقیقت ایک مہلتِ حیات کا نام ہے۔ وقت انسان کے پاس ایک نعمتِ حیات کا نام ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ اقدس میں ایک بہترین مسلمان اور ایک عمدہ انسان وہ ہے جس کا وقت اور جس کی حیات فضول اور بے مقصد کاموں سے بچ جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه۔ (سنن ترمذی)

وہ شخص بہترین مسلمان ہے جو اپنی زندگی سے بے مقصد چیزوں کو نکال دے۔

لایعنی بے مقصد چیزیں کیا ہیں؟ ہمیں یہ بات ہارون الرشید کے اس واقعہ سے بھی سمجھ آسکتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک حیرت انگیز کرتب دکھایا گیا۔ ایک شخص نے دربار کے فرش پر ایک سوئی کھڑی کی اور خود تھوڑی دور دس سوئیاں اٹھائے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دور سے کھڑے ہو کر سوئی پھینکی اور وہ سوئی فرش پر کھڑی سوئی کے ناکے سے گزر گئی۔ سب درباریوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس طرح اس نے دس سوئیاں پھینکیں اور دس کی دس سوئی کے ناکے سے گذر گئیں۔

ہارون الرشید نے اس کے حیرت انگیز کمال پر انعام دینے کا فیصلہ کیا اور حکم دیا اس کو دس دینار انعام دیئے جائیں اور دس کوڑے مارے جائیں۔ درباری حیران ہوئے کہ دس دینار کی تو سمجھ آتی ہے مگر دس کوڑوں کی سمجھ نہیں آتی۔ اس عجیب و غریب انعام کی وجہ ہارون الرشید نے یہ بتائی کہ دس دینار اس شخص کی ذہانت اور اس کے پختہ نشانہ رکھنے کا انعام ہے اور دس کوڑے اس بات کی سزا ہے کہ اس نے اپنی خداداد صلاحیتیں اور اپنا قیمتی وقت ایک ایسے کام میں صرف کیا جس کا دین و دنیا کو کوئی فائدہ نہیں۔

محترم قارئین! وقت ہمارے پاس ایک نعمتِ خداوندی ہے۔ یہ وقت دنیا کی سب سے بڑی قیمتی چیز ہے۔ اس لیے کہا گیا: الوقت من ذھب۔ وقت بھی ایک سونا ہے۔۔۔ الوقت ھوالحیاۃ، یہ وقت ہماری حیات ہے۔۔۔ الوقت کالسیف ان لم تقطعہ قطعك۔ وقت دو دھاری تلوار ہے اگر تم نے اسے نہ کاٹا تو یہ تمہیں کاٹ دے گا۔۔۔ الوقت سیف قاطع۔ وقت کاٹنے والی دو دھاری تلوار ہے۔

آج ہمیں اپنے کاروانِ حیات میں کامیابی کی منزل پر پہنچنا ہے تو ہمیں اپنے وقت کا صحیح استعمال کرنا ہے، ہمیں ہر روز کو بہتر کرنا ہے اور ہمیں اپنے آج کو سنوارنا ہے۔ ہمارا آج اگر سنور جائے گا تو ہمارا کل بھی سنور جائے گا۔ ہمارا آج ہی ہمارا کل زمانہ ہے۔ اس لیے اقبال نے کہا:

زمانہ کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو، باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

احسان اور اخلاص کی حقیقت

ڈاکٹر محمد اقبال چشتی سینئر ریسرچ اسکالر

قرآنِ کریم کا اعلان محض ایک تسلی نہیں بلکہ ایک اٹل الٰہی قانون ہے، جو اس کائنات کے اخلاقی و روحانی نظام کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل قدر و قیمت عمل کی کثرت یا ظاہری چمک کی نہیں بلکہ احسان اور اخلاص کی ہے۔ محسن وہ ہے جو ہر عمل اس شعور کے ساتھ انجام دے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ مقام نصیب نہ ہو تو کم از کم یہ یقین اس کے دل میں زندہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے ضرور دیکھ رہا ہے۔ یہی کیفیتِ احسان بندے کے عمل کو وزن، روح اور دوام عطا کرتی ہے۔

مُحسنین کون لوگ ہیں؟

اسلامی تناظر میں مُحسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی کو کسی صلہ، شہرت یا دنیاوی فائدے کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے انجام دیتے ہیں۔ ان کی عبادت خاموش ہوتی ہے، خدمت بے آواز ہوتی ہے اور قربانی بے نمائش۔ ایسے لوگ معاشرے میں چراغ کی مانند ہوتے ہیں؛ خود کو موم بتی کی مانند جلا کر دوسروں کو روشنی فراہم کرتے ہیں مگر اپنی روشنی کا اعلان نہیں کرتے۔ قرآن مجید نے واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا، چاہے دنیا انہیں پہچانے یا نہ پہچانے، کیونکہ ان کا معاملہ لوگوں سے نہیں بلکہ ربِّ کریم سے ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ دکھاوے کے لیے عمل کرتے ہیں، جن کا مقصد لوگوں سے تعریف وداد کا حصول اور سماجی پہچان ہوتا ہے، وہ اخلاص کے اس مقام سے محروم رہتے ہیں۔ ریاکاری عمل کو کھوکھلا کر دیتی ہے؛ بظاہر نیکی ہوتی ہے مگر باطن میں نیت کی خرابی اور ریاء کاری اُسے بے وزن بنا دیتی ہے۔ ایسے اعمال نہ احسان کے درجے پر فائز ہوتے ہیں اور نہ ہی اخلاص کی خوشبو رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ محسنین اور مخلصین کی صف میں شامل نہیں ہوتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا معیار نیت ہے، نمائش نہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ (التوبہ، ۹: ۱۲۰)

”بے شک اللہ نیکوکاروں کا اَجر ضائع نہیں فرماتا۔“

یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ بندہ اگر خاموشی سے نیکی کرے، اگر نیکی کرنے والے کا دل اللہ کے حضور جھکا ہوا ہو اور اس کی نیت پاکیزہ ہو، تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ دنیا میں شاید اس کے عمل کا چرچا نہ ہو، مگر آخرت میں وہ عمل نور بن کر سامنے آئے گا۔

پس حقیقی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کو اخلاص کے سانچے میں ڈھالے، دکھاوے سے بچے، اور احسان کے اس درجے کو حاصل کرے جہاں عمل صرف اللہ کے لیے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ محسنین اور مخلصین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

مذکورہ بالا آیت کی آفاقی وسعت دیکھیں کہ پورے قرآن میں یہ آیت تین مرتبہ ذکر کی گئی ہے۔ (۱) سورۃ توبہ، آیت نمبر ۱۲۰، (۲) سورۃ ھود، آیت نمبر: ۱۱۵، (۳) سورۃ یوسف، آیت نمبر: ۹۰۔ یعنی قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر یہ فرمادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اِحسان کرنے والے کا اَجر ضائع نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا

محسنین وہ لوگ ہیں جنہوں نے جو بھی نیکی کا کام کیا اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوقِ خدا سے کوئی اَجر، صلہ، معاوضہ یا انعام طلب کرنے کی خواہش نہ رکھی۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ کا نام اگر آج بھی دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر دینِ متین کے ساتھ مخلص اور محسن تھے۔ اگر علم الحدیث کی بات ہو گی تو امام بخاریؒ کا ذکر کیے بغیر یہ بات مکمل نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اُنہوں نے مختلف ممالک کے طول و عرض میں جا کر نبی اکرم ﷺ کی اَحادیث جمع کیں اور یہ کارنامہ اُنہوں نے

اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے محض اِخلاص اور نیکی کے حصول کی خاطر کیا۔اُن کے اِخلاس کی قدر و قیمت یہ ہے کہ آج بھی ان کا نام علم الحدیث کے تناظر میں زندہ ہے اور ہمیشہ قیامت تک یاد رکھا جائے گا۔

امام مالکؒ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ ''موطا'' تصنیف فرمارہے ہیں جبکہ اسی طرز پر اور لوگ بھی کتابیں لکھ چکے ہیں، تو آپؒ نے نہایت بصیرت افروز جواب دیا کہ اصل بقاء تعداد، شہرت یا اسلوب میں نہیں بلکہ اخلاص میں ہوتی ہے۔ آپؒ کے نزدیک وہی علمی کاوش زندہ رہتی ہے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، کیونکہ علم اگر نیت کی آمیزش سے پاک نہ ہو تو وقت کی گرد میں گم ہو جاتا ہے۔ امام مالک علیہ الرحمہ نے فرمایا:

مَا كَانَ لِلّٰهِ بَقِيَ.

(صنعانی، محمد بن اسماعیل، توضیح الافکار، جلد ۱، ص ۴۹)

''جو کام اللہ تعالیٰ کے لیے (اِخلاص اور اِحسان کے ساتھ کیا گیا) ہو، وہی باقی رہتا ہے۔

یہ مختصر مگر جامع جملہ امام مالکؒ کے علمی منہج اور فکر کا نچوڑ ہے، اور اسی اخلاص نے آپ کی تالیف کردہ کتاب ''موطا'' کو زندہ و جاوید بنا دیا۔

تاریخ نے امام مالکؒ کے اس اصول کی تصدیق کر دی کہ صدیاں گزرنے کے باوجود موطا امام مالک آج بھی امت کے علمی ورثے میں زندہ، معتبر اور مقبول ہے، اور یہ اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ اخلاص علم کو دوام عطا کرتا ہے۔

اِسی طرح ہمارے اسلاف علماء و محدثین کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اُنہوں نے کس عرق ریزی کے ساتھ دینِ متین کی خدمت کی اور اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ مخلص و محسن بن کر رہے اور آج بھی اُن کا نام زندہ و تابندہ ہے اور قیامت تک روشن رہے گا۔

اللہ کے نزدیک تقوی، اخلاص اور نیت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعمال کی قدر و قیمت اُن کی ظاہری شکل یا کثرت سے نہیں بلکہ تقویٰ، اخلاص اور نیت کی سچائی سے متعین ہوتی ہے۔ جو عمل صرف دکھاوے، شہرت یا لوگوں کی داد کے لیے کیا جائے وہ بظاہر نیکی ہونے کے باوجود اللہ کے ہاں وزن نہیں رکھتا، جبکہ خالص نیت اور تقویٰ کے ساتھ کیا گیا چھوٹا سا عمل بھی قبولیت کا درجہ پالیتا ہے۔ اسی لیے اسلام انسان کو ظاہر کی اصلاح کے ساتھ باطن کی پاکیزگی کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ اللہ دلوں کے حال کو جانتا ہے اور وہی نیت کے مطابق اعمال کو قبول فرماتا ہے۔ امام بغوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(لَنْ يَنَالَ اللهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا) قَالَ مُقَاتِلٌ: لَنْ يُرْفَعَ إِلَى اللهِ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا، (وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ، وَلَكِنْ تُرْفَعُ إِلَيْهِ مِنْكُمُ الْأَعْمَالُ الصَّالِحَةُ وَالتَّقْوَى وَالْإِخْلَاصُ، مَا أُرِيدَ بِهِ وَجْهُ اللهِ (بغوی، معالم التنزیل، جلد ۳، ص ۲۸۹)

"اللہ تک نہ اُن (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اُن کا خون۔ امام مقاتلؒ فرماتے ہیں: اللہ کی طرف نہ اُن کا گوشت اٹھایا جاتا ہے اور نہ اُن کا خون،" بلکہ تمہارا تقویٰ اُس تک پہنچتا ہے" یعنی تمہاری طرف سے اللہ کے حضور نیک اعمال، تقویٰ اور اخلاص پہنچتے ہیں، وہ اعمال جو صرف اللہ کی رضا کے لیے کیے گئے ہوں۔"

اسی طرح اگر اخلاص اور احسان کی مزید بات کی جائے اور حدیثِ نبوی کی روشنی میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ جو عمل اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے صرف کیا جائے اُس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور عرض کیا:

يَا رَسُولَ اللهِ ﷺ، إِنِّي أَتَصَدَّقُ بِالشَّيْءِ، وَأَصْنَعُ الشَّيْءَ، أُرِيدُ بِهِ وَجْهَ اللهِ وَثَنَاءَ النَّاسِ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَقْبَلُ اللهُ شَيْئًا شُورِكَ فِيهِ.

(قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۱۵، ص ۲۳۳)

"یارسول ﷺ! بے شک میں جب بھی کوئی صدقہ کرتا ہوں یا کوئی نیک عمل انجام دیتا ہوں، اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی چاہتا ہوں اور لوگوں کی تعریف بھی۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس

ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی ایسے عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں (اللہ کے ساتھ) کسی اور کو شریک کیا جائے۔"

ایک شخص حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ!

إِنَّا لَنَعْمَلُ الْعَمَلَ نُرِيْدُ بِهِ وَجْهَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَيُثْنَى بِهِ عَلَيْنَا فَيُعْجِبُنَا ذَلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: إِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ لَا يَقْبَلُ مَا شُوْرِكَ فِيْهِ.

(ابوالحسن مقاتل بن سلیمان، تفسیر القرآن، جلد ۲، ص ۳۰۴)

"بے شک ہم ضرور جب کوئی نیک عمل کرتے ہیں، اس میں اللہ عزوجل کی رضا چاہتے ہیں، پھر اُس عمل پر لوگ ہماری تعریف بھی کرتے ہیں اور وہ تعریف ہمیں اچھی لگتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، وہ ایسے عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں (اس کی رضا کے ساتھ) کسی اور کو شریک کیا گیا ہو۔"

امام سلمی لکھتے ہیں:

العمل الصالح ما أريد به وجه الله لا غير والأجر الحسن.... وقال بعضهم من ربط عمله بالإخلاص صلح عمله ومن صلح فله عند الله أجر حسن.

(سلمی، تفسیر السلمی، جلد ۱، ص ۴۰۰)

"نیک عمل وہی ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، اور اسی پر اچھا اجر ملتا ہے۔ اور بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جس شخص نے اپنے عمل کو اخلاص کے ساتھ جوڑ دیا، اس کا عمل درست ہو گیا، اور جس کا عمل درست ہو گیا، اس کے لیے اللہ کے ہاں بہترین اجر ہے۔"

کسی بھی عمل کی قبولیت کا مدار اخلاص پر مبنی ہے

کسی بھی عمل کی قبولیت کا اصل دار و مدار اس کی ظاہری صورت یا کثرت پر نہیں بلکہ اخلاص پر ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے حال اور نیتوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ جو عمل صرف اسی کی رضا کے لیے کیا جائے، چاہے وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، وہ اللہ کے ہاں وزن اور قدر پالیتا ہے، جبکہ دکھاوے، شہرت یا دنیاوی مفاد کی آمیزش عمل کو بے اثر بنا دیتی ہے۔ اسلام انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ نیکی کی روح اخلاص ہے، اور یہی اخلاص عمل کو زندہ، بابرکت اور قابلِ قبول بناتا ہے، کیونکہ اللہ کے نزدیک وہی عمل معتبر ہے جو خالص اسی کے لیے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ أَعْطَى لِلّٰهِ، وَمَنَعَ لِلّٰهِ، وَأَحَبَّ لِلّٰهِ، وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ، فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيمَانَهُ.

(طبرانی، المعجم الکبیر، جلد ۲۰، ص ۱۸۸، رقم: ۴۱۲)

”جس نے اللہ کی رضا کے لیے کسی کو کوئی چیز دی، اور اللہ کے لیے کسی سے کچھ روکا، اور اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے کسی کے ساتھ بغض رکھا، تو ضرور اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔“

اس حدیث کے تناظر میں دیکھا جائے تو تمام دین اخلاص و احسان پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اس میں ریاء کاری یا نمود و نمائش کرتا ہے تو وہ نیکی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اُسے معلوم بھی نہیں ہوتا۔

دورِ جدید میں دکھاوا اور نمائش

دورِ جدید میں عبادات، خیرات اور نیکی کے اعمال کو سوشل تشہیر اور ذاتی نمائش کا ذریعہ بنا دینا ایک خطرناک فکری اور روحانی بیماری بنتا جا رہا ہے، حالانکہ اسلامی تعلیمات میں ریاء کاری، دکھاوا اور نمائش کو صریح گناہ قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نیکی کو اس کی ظاہری نمائش سے نہیں بلکہ نیت کی پاکیزگی سے پرکھتا ہے، کیونکہ جو عمل اللہ کے سوا کسی اور کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے وہ ثواب کے بجائے وبال بن جاتا ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مومن کا شعار یہ ہے کہ وہ نیک عمل کرتے وقت اخلاص کو بنیاد بنائے اور احسان کے درجے پر فائز ہونے کی کوشش کرے، یعنی اللہ کی رضا کو پیشِ نظر رکھے نہ کہ لوگوں کی داد و تحسین کو۔ اس لیے حقیقی دینداری اسی میں ہے کہ نیکی خاموشی، عاجزی اور خلوص کے ساتھ کی جائے، کیونکہ اللہ وہ عمل قبول فرماتا ہے جو دکھاوے سے پاک اور صرف اسی کے لیے ہو۔

آج کل بہت سارے پیر، بہت سارے علماء اور مفتیان دکھاوے کے ساتھ لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور باتیں تصوف و روحانیت کی کرتے ہیں جبکہ اُن کے قول و فعل میں خود تضاد نظر آ رہا ہوتا ہے۔

قرآنی وعدہ اور حیاتِ ایمانی

قرآنِ کریم کا یہ بلیغ اعلان کہ ”بیشک اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا“ ایک ایسا ابدی اصول ہے جو ایمان، عمل اور اخلاق تینوں کو یکجا کر دیتا ہے۔ یہ آیت بندۂ مؤمن کو یقین عطا کرتی ہے کہ اس کی محنت، قربانی اور نیکی خواہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہی کیوں نہ ہو، ربِ کریم کے ہاں محفوظ ہے اور ضائع نہیں ہو سکتی۔

اسلام میں احسان محض ظاہری عبادت کا نام نہیں بلکہ باطن کی کیفیت ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے احسان کی تعریف یوں فرمائی: ”احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو یہ یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ یہی احساس بندے

کے اعمال کو زندہ، بامقصد اور بابرکت بنا دیتا ہے۔ محسن وہ ہے جو ہر نیکی میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھے، نہ کہ اپنی نمائش کو۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر عمل کی روح اخلاص ہے۔ نیت اگر خالص ہو تو چھوٹا عمل بھی بڑا بن جاتا ہے اور اگر نیت خراب ہو تو بڑا عمل بھی بے وزن رہ جاتا ہے۔ مخلص بندہ تعریف و تحسین کا محتاج نہیں ہوتا؛ اسے یہ یقین کافی ہوتا ہے کہ اللہ اس کے عمل کو جانتا اور دیکھتا ہے۔ یہی اخلاص محسنین کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر محسنین کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے محبت فرماتا ہے، ان کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور ان کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ محسنین کی نیکی وقتی نہیں ہوتی بلکہ مستقل ہوتی ہے، اور ان کا اجر محض دنیا تک محدود نہیں بلکہ آخرت میں بھی محفوظ رہتا ہے۔

دوسری طرف ریا یعنی دکھاوا ایک ایسا روحانی مرض ہے جو عمل کی اصل قدر کو ختم کر دیتا ہے۔ جو لوگ نیکی اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ دیکھیں، تعریف کریں اور واہ واہ کریں، وہ دراصل اللہ کے لیے نہیں بلکہ مخلوق کے لیے عمل کرتے ہیں۔ ایسے اعمال بظاہر نیکی نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں اخلاص سے خالی ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ نہ محسنین میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ہی مخلصین میں۔

حاصلِ کلام

بندۂ مؤمن کو اپنے ہر عمل میں اخلاص کو لازم پکڑنا چاہیے اور دکھاوے سے خود کو بچانا چاہیے۔ کیونکہ اللہ کے ہاں وہی عمل معتبر ہوتا ہے جو دل کی گہرائی سے، خالص نیت کے ساتھ اور صرف اس کی رضا کے لیے کیا جائے۔ اسلام نے ریاکاری کو سختی سے ناپسند کیا ہے، کیونکہ یہ نیت کو آلودہ اور عمل کو بے روح بنا دیتی ہے۔ دکھاوے والے لوگ اپنی نیکی کا صلہ دنیا میں چاہتے ہیں، اس لیے آخرت میں ان کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ان کا عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوتا، کیونکہ قبولیت کا معیار لوگوں کی داد نہیں بلکہ دل کی سچائی ہے۔ اصل کامیابی اعمال کی تعداد میں نہیں بلکہ نیت کی پاکیزگی میں ہے۔ جو بندہ خاموشی سے نیکی کرتا ہے، کسی تعریف کا طالب نہیں ہوتا اور ہر عمل اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے، وہی حقیقی معنوں میں محسن ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، چاہے دنیا انہیں پہچانے یا نہ پہچانے۔

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فریدالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ
علمی و روحانی عظمت کا سفر

محمد یوسف منہاجین

تاریخ کے ماتھے پر کچھ نام ایسے جھلملاتے ہیں جن کی روشنی وقت کے ساتھ مدہم نہیں ہوتی، بلکہ ان کے افکار کی خوشبو آنے والی نسلوں کے مشامِ جاں کو معطر رکھتی ہے۔ ایسی ہی ایک قد آور شخصیت حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی ہے، جن کا تعلق پنجاب کے ایک ایسے خانوادے سے تھا جس کی جڑیں تقویٰ، سخاوت اور بلند کرداری میں پیوست تھیں۔ آپ کے والدِ گرامی، جو خود ایک نیک سیرت اور صاحبِ فہم انسان تھے، نے اس خاندانی روایت کو برقرار رکھا جہاں رزقِ حلال اور علم کی تڑپ کو زندگی کا حاصل سمجھا جاتا تھا۔ فریدِ ملت کی تربیت میں ان کے گھرانے کے اسی پاکیزہ ماحول کا بڑا دخل تھا، جس نے ان کے اندر بچپن ہی سے ایک خاص قسم کا وقار اور استغناء پیدا کر دیا تھا۔

ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو وہ دور برصغیر کی مسلم سیاست اور علمی زوال کا ایک کڑا وقت تھا۔ آپ کی پیدائش ہی سے آپ کے چہرے پر وہ آثار نمایاں تھے جو کسی غیر معمولی مستقبل کی نوید دیتے ہیں۔ آپ کا بچپن عام بچوں کی طرح کھیل کود میں ضائع نہیں ہوا، بلکہ قدرت نے آپ کے دل میں کتابوں کی محبت اور تنہائی میں غور و فکر کا مادہ ودیعت کر رکھا تھا۔ آپ کی طبیعت میں ابتداء سے ہی شرم و حیا اور متانت تھی۔ یہی وہ ابتدائی سال تھے جنہوں نے آپ کی شخصیت میں فولادی عزم کی بنیاد رکھی۔

علم کی پیاس فریدِ ملت کے خمیر میں شامل تھی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور مقامی علماء سے حاصل کی، جہاں آپ نے قرآن مجید اور عربی و فارسی کے بنیادی علوم میں اس قدر تیزی سے مہارت حاصل کی کہ اساتذہ حیران رہ گئے۔ آپ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ کی علمی استعداد کا عالم یہ تھا کہ آپ مشکل ترین فارسی اشعار کو نہ صرف حفظ کر لیتے بلکہ ان کی تشریح بھی عالمانہ انداز میں کرتے تھے۔ آپ کی نظر صرف درسی کتب تک محدود نہ تھی بلکہ آپ نے اس دور کے نامور کتب خانوں کا رخ کیا تاکہ علم کے ہر چشمے سے سیراب ہو سکیں۔ آپ کی جوانی جہدِ مسلسل کی ایک ایسی داستان ہے جہاں راتوں کو چراغ جلا کر مطالعہ کرنا اور دن کو اساتذہ کی صحبت میں رہنا آپ کا معمول بن چکا تھا۔

حضرت فریدِ ملت کی زندگی کا ایک اہم موڑ وہ تھا جب آپ نے علمِ طب کو اپنے مستقبل کے طور پر چنا۔ یہ انتخاب محض ایک پیشہ ورانہ فیصلہ نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے انسانیت کی خدمت کا وہ جذبہ کارفرما تھا جو آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ نے اس فن کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے لکھنؤ جیسے علمی مراکز کا رخ کیا، جہاں اس وقت طبِ یونانی کے بڑے بڑے اساطین موجود تھے۔ آپ نے وہاں رہ کر نہ صرف نبض شناسی سیکھی بلکہ ادویات کی کیمیا گری اور انسانی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ آپ کے نزدیک طب ایک ایسی عبادت تھی جس کے ذریعے اللہ کی دکھی مخلوق کے دلوں میں جینے کی امنگ پیدا کی جاسکتی تھی۔ آپ کے مطب کی شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی، کیونکہ وہاں دوا کے ساتھ دعا اور شفقت کا ایک خاص لمس بھی موجود ہوتا تھا۔

حضرت فریدِ ملتؒ کی شخصیت کے مذکورہ بنیادی عناصر نے انہیں دوسروں سے ممتاز کیا۔ آپ کی سادگی، سچائی اور اپنے مقصد سے لگن نے آپ کو ایک ایسی چٹان بنا دیا تھا جس سے ٹکرا کر مشکلات خود راستہ بدل لیتی تھیں۔ آپ کی زندگی کا یہ ابتدائی دور ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ عظمت کے مینار ہمیشہ محنت، خلوص اور علم کی بنیادوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنی ذات کو نکھارنے کے لیے جو ریاضت کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کا وجود ایک شجرِ سایہ دار بن گیا جس تلے ہزاروں پیاسے اپنی پیاس بجھانے آئے۔

علمی مقام اور تحقیق کا منفرد اسلوب

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کا علمی سفر محض روایتی ڈگریوں کے حصول کی داستان نہیں ہے، بلکہ یہ حق کی تلاش اور علم کے جوہر تک پہنچنے کی ایک مسلسل تڑپ ہے۔ آپ نے صرف

کتابوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے مشاہدات اور تجربات سے علم کے نئے ابواب روشن کیے۔ آپ کو عربی اور فارسی زبان وادب پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ آپ پیچیدہ علمی مباحث کو سلیس اور عام فہم انداز میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی علمی ثقاہت کا اعتراف ان کے دور کے بڑے بڑے علماء اور مفتیانِ کرام نے کیا اور آپ کے علمی مقام کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے آپ کو "صاحبِ بصیرت محقق" قرار دیا ہے۔ آپ کی علمی مجلس میں بیٹھنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ آپ کا مطالعہ محض سطحی نہیں بلکہ آپ ہر موضوع کی تہہ تک پہنچ کر اس کا خلاصہ پیش کرنے کے عادی تھے۔

۱۔ فریدِ ملت کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو ان کی طب اور حکمت میں مہارت ہے۔ آپ نے طب کو محض ایک خاندانی پیشے کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ اسے ایک فن اور خدمتِ انسانیت کا مقدس مشن بنایا۔ آپ نے لکھنؤ کے عظیم طبّی مراکز سے فیض حاصل کیا، جو اس وقت پورے برصغیر میں حکمت کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے۔ وہاں آپ نے مستند اساتذہ کی زیرِ نگرانی نبض شناسی اور جڑی بوٹیوں کے خواص پر وہ ملکہ حاصل کیا جو آپ کے معاصرین میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔

حضرت فریدِ ملت فنِ طب کے ایک ایسے محقق تھے جن کی تشخیص پر بڑے بڑے ڈاکٹرز بھی حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ آپ صرف نبض دیکھ کر مریض کی جسمانی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی حالت کا بھی درست اندازہ لگا لیتے تھے۔ آپ کا مطب محض ادویات کا مرکز نہیں بلکہ ناامید مریضوں کے لیے شفا اور امید کی ایک پناہ گاہ تھا۔

۲۔ حصولِ علم کے لیے فریدِ ملت نے جن کٹھن حالات میں سفر کیا، وہ آج کی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آپ نے لکھنؤ میں قیام کے دوران جس صبر اور استقلال کا مظاہرہ کیا، اس نے آپ کے فن میں پختگی پیدا کی۔ وہاں کے اساتذہ آپ کی ذہانت اور لگن دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یہ نوجوان حکمت کی دنیا میں کوئی بڑا انقلاب برپا کرے گا۔ آپ نے وہاں کی علمی فضاؤں سے یہ نکتہ سیکھا کہ طبیب کا کام صرف نسخہ لکھنا نہیں بلکہ مریض کی روح کے کرب کو سمجھنا بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ واپس لوٹے تو آپ کے ہاتھ میں وہ شفا تھی جس کا چرچا پورے علاقے میں پھیل گیا۔

بین الاقوامی علمی اسفار

فریدِ ملت کی سوچ کبھی مقامی حدود تک محدود نہیں رہی۔ آپ نے علم کی تلاش میں دور دراز کے اسفار کیے۔ ان اسفار کا مقصد محض سیر وسیاحت نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں کے علمی ورثے کا مشاہدہ کرنا تھا۔ آپ نے عرب ممالک اور دیگر علمی مراکز کا دورہ کیا تاکہ امتِ مسلمہ کے زوال کے اسباب کو

قریب سے دیکھ سکیں اور ان کا حل تلاش کر سکیں۔ ان اسفار کے دوران آپ نے نامور علماء اور مفکرین سے ملاقاتیں کیں اور ان کے ساتھ علمی تبادلہ خیال کیا۔

ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کے علمی اور روحانی ذوق نے انہیں ہمیشہ بے قرار رکھا۔ آپ نے زندگی کے مختلف ادوار میں ایران، عراق، ترکی اور شام کے طویل اسفار کیے۔ ان اسفار کا مقصد محض سیاحت نہیں بلکہ اکابر اولیاء اور جید علماء کی صحبت سے فیض پانا تھا۔ آپ کے تحریر کردہ "سفر نامہ" (جو اب جدید ایڈیشن کے ساتھ دستیاب ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دمشق میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مزارِ اقدس پر حاضری دی، بغداد میں نسبتِ قادری کی تجدید کی اور ترکی و ایران کے علمی مراکز کا گہرا مشاہدہ کیا۔ ان اسفار نے آپ کے علمی افق کو وہ وسعت عطا کی جو آپ کی تشخیص اور فکر میں آفاقیت بن کر جھلکتی ہے۔ آپ کے یہ مشاہدات ثابت کرتے ہیں کہ آپ کا علم صرف کتابی نہیں تھا بلکہ آپ نے "سیروا فی الارض" کے قرآنی حکم پر عمل کرتے ہوئے کائنات کے اسرار کو قریب سے دیکھا تھا۔

آپ کی ڈائری اور خط و کتابت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں کو دوبارہ سے علمی اور فکری طور پر کیسے مستحکم کیا جائے۔ آپ کے ان اسفار نے آپ کی بصیرت کو وسعت دی اور آپ کے اسلوب میں وہ آفاقیت پیدا کی جو آج ہمیں ان کے فکری وارثین میں نظر آتی ہے۔

حضرت فریدِ ملتؒ کی زندگی کا ایک معتبر حوالہ ان کے بارے میں معاصر اکابرین کے تاثرات ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں وہ رعب اور وقار تھا جو سچے علم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے، لوگ ان کی علمی گفتگو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ ان کی عاجزی کا یہ عالم تھا کہ اتنے بڑے مقام پر ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالبِ علم ہی سمجھتے رہے۔ ان کے علمی قد کاٹھ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دور کی بڑی بڑی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کے قائدین کے لیے ایک فکری مشیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی رائے کو علمی حلقوں میں سند تسلیم کیا جاتا تھا۔

فکری وراثت

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ صرف ایک معالج ہی نہیں بلکہ ایک صاحبِ قلم محقق بھی تھے۔ آپ کی علمی زندگی کا ایک بڑا حصہ مطالعہ اور تحقیق میں گزرا۔ آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا، جن میں فنِ طب، اخلاقیات اور دینی مباحث شامل ہیں۔ آپ کی تحریروں میں وہی علمی وقار اور منطقی استدلال پایا جاتا ہے جو آپ کی گفتگو کا خاصہ تھا۔ آپ کے علمی مقالات اور خطوط، جو معاصر

علماء کے نام لکھے گئے، آپ کی جلالتِ علمی اور وسعتِ نظری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ نے پیچیدہ طبّی مسائل کو جس سہولت کے ساتھ ادبی پیرائے میں بیان کیا، وہ آپ کے اسلوبِ بیان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ کی فکری وراثت کا سب سے بڑا حصہ وہ علمی اسلوب ہے جس میں تحقیق کی گہرائی بھی ہے اور ابلاغ کی سادگی بھی۔

۱۔ آپ کے علمی قد کاٹھ کی بنیاد آپ کا وسیع مطالعہ تھا۔ آپ کے پاس ایک نایاب کتب خانہ موجود تھا جس میں طب، حدیث، تفسیر اور تصوف کی اہم کتب شامل تھیں۔ آپ مطالعہ کے اس قدر رسیا تھے کہ سفر و حضر میں کتاب آپ کی بہترین رفیق رہتی۔ آپ کے حواشی اور کتابوں پر کیے گئے نوٹ آپ کی گہری علمی فکر کا پتا دیتے ہیں۔ آپ نے اپنے فرزندِ ارجمند کو بھی یہی نصیحت کی تھی کہ "کتاب سے رشتہ کبھی نہ توڑنا، کیونکہ کتاب تنہائی کی بہترین ساتھی اور اندھیروں کا چراغ ہے"۔

۲۔ ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کا علمی شجرہ اور اسانیدِ حدیث ان کے علمی رتبے کی گواہی دیتے ہیں۔ آپ نے حجازِ مقدس اور دیگر ممالک کے سفر کے دوران جید علماء سے حدیثِ نبوی ﷺ کی اجازت حاصل کی، جس نے آپ کو علمی وراثت کے اس تسلسل سے جوڑ دیا جو براہِ راست سرورِ کائنات ﷺ تک پہنچتا ہے۔ ان اسانید کا حصول محض ایک اعزاز نہ تھا بلکہ یہ اس ذمہ داری کا احساس تھا جسے آپ نے اپنی پوری زندگی میں نبھایا۔

آپ کو حاصل ہونے والی اسانید اور اجازاتِ حدیث یہ ثابت کرتی ہیں کہ آپ کا علمی سلسلہ عالمِ اسلام کے مستند ترین مراکز سے جڑا ہوا تھا۔ آپ کی یہ علمی جلالت صرف پاکستان تک محدود نہ تھی بلکہ حجاز اور شام کے شیوخ بھی آپ کی بصیرت کے معترف تھے۔

۳۔ فریدِ ملت کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جہاں قدیم روایتی علوم کے محافظ تھے، وہاں جدید سائنسی اور طبّی ترقی سے بھی بے خبر نہ تھے۔ آپ نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کو دورِ جدید کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے سائنسی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ آپ کی فکر میں کہیں بھی جمود نظر نہیں آتا۔ آپ نے طبِ یونانی میں جدید مشاہدات کو شامل کر کے اسے ایک نئی زندگی بخشی۔ آپ کا مطب جہاں ایک روایتی شفاخانہ تھا، وہیں وہ ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

۴۔ ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی علمی مجالس علم و حکمت کا وہ سمندر تھیں جہاں سے ہر کوئی اپنی ظرف کے مطابق موتی سمیٹتا۔ آپ کی محفل میں بیٹھنے والا ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ آپ کے پاس کتب کے مطالعے کے علاوہ کچھ ایسے باطنی مشاہدات بھی ہیں جو عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ آپ کی گفتگو میں وہ اثر تھا جو صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو

جائے۔ آپ کے کئی نادر مشاہدات ایسے ہیں جن میں آپ نے آنے والے وقت کے فکری تغیرات کی پیش گوئی کی تھی، جو آج کے دور میں حرف بحرف سچ ثابت ہو رہی ہیں۔

علمی زہد اور شہرت سے گریز

حضرت فریدِ ملتؒ کی شخصیت کا وہ پہلو جو انہیں اکابرین میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے، وہ ان کا "علمی زہد" تھا۔ ان کے معاصرین کی یادداشتوں سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ کے پاس علم، فن اور روحانیت کا وہ خزانہ تھا جس کے بل بوتے پر آپ شہرت کی بلندیوں کو چھو سکتے تھے، مگر آپ نے "گمنامی" کو ترجیح دی۔ آپ کا مطب (کلینک) محض ایک طبّی مرکز نہیں بلکہ ایک فکری پناہ گاہ تھا جہاں آپ خاموشی سے لوگوں کے عقائد اور نظریات کی اصلاح فرماتے۔ آپ کا اندازِ بیان اتنا جاندار تھا کہ بڑے بڑے منطقی آپ کی گفتگو کے سامنے لاجواب ہو جاتے۔ آپ نے کبھی اپنی کرامات یا علمی فتوحات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا، بلکہ ہمیشہ "خادمِ انسانیت" کہلوانے میں فخر محسوس کیا۔

عشقِ رسول ﷺ اور روحانیت

ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی پوری زندگی کا اگر ایک لفظ میں خلاصہ کیا جائے تو وہ "عشقِ رسول ﷺ" ہے۔ آپ کے شب و روز ذکرِ مصطفیٰ ﷺ سے مہکتے تھے۔ جب کبھی مدینہ منورہ یا حضور سرورِ کائنات ﷺ کا ذکر آتا، تو آپ کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں اور آپ پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ آپ نے اپنی اولاد کی تربیت میں بھی اسی عشق کو بنیاد بنایا۔ آپ کا معمول تھا کہ کثرت سے درود و سلام کا نذرانہ پیش کرتے اور نعت خوانی کی محافل میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے۔ آپ کی نعت گوئی اور نعت خوانی محض رسم نہ تھی بلکہ یہ آپ کے قلب کی پکار تھی۔

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی زندگی کا سب سے پر کیف پہلو ان کا وہ عشق ہے جو انہیں حرمین شریفین کی مقدس دھرتی سے تھا۔ آپ جب بھی دیارِ حرم کا رخ کرتے تو ایک عام مسافر کی طرح نہیں بلکہ ایک سچے عاشق کی طرح وہاں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناتے تھے۔ مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت آپ پر جو رقت طاری ہوتی، وہ آپ کے عشقِ رسول ﷺ کی گواہ تھی۔ آپ کے رفقاء بیان کرتے ہیں کہ مسجدِ نبوی ﷺ کے مواجہہ اقدس میں کھڑے ہو کر آپ کا درود و سلام پڑھنا اور زار و قطار رونا دیکھنے والوں کے دل پگھلا دیتا تھا۔

فریدِ ملت کی زندگی محض ظاہری علوم یا طبّی مہارت تک محدود نہ تھی، بلکہ آپ کی شخصیت کا اصل جوہر وہ روحانیت تھی جس نے آپ کے ظاہر و باطن کو منور کر رکھا تھا۔ آپ کی روحانیت کوئی روایتی

پیری مریدی کا نام نہ تھا، بلکہ یہ وہ کیفیات تھیں جو تنہائی کی عبادتوں اور سحر خیزیوں سے پیدا ہوتی تھیں۔ آپ اکثر راتوں کو اپنے رب کے حضور گریہ وزاری کرتے اور امتِ مسلمہ کی بخشش و فلاح کے لیے دعائیں مانگتے۔ یہی وہ روحانی پاکیزگی تھی جس نے آپ کی گفتگو میں وہ تاثیر پیدا کر دی تھی کہ سننے والے کے دل کی دنیا بدل جاتی۔ آپ کا ماننا تھا کہ جب تک دل اللہ کی یاد سے آباد نہ ہو، ظاہری علم انسان کو کبر و غرور میں مبتلا کر دیتا ہے۔

فرنگی محل لکھنؤ

فریدِ ملت کی روحانیت کا ایک مضبوط ستون حضور غوثِ پاک شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذاتِ گرامی اور ان کے خاندان سے آپ کی گہری نسبت اور ایک خاص قلبی تعلق تھا۔ آپ نے بغداد شریف کے اس مبارک خاندان کے چشم و چراغ کی صحبت سے خصوصی فیض پایا۔ یہ نسبت محض عقیدت تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے آپ کے اخلاق، آپ کے تقویٰ اور آپ کی روحانی زندگی کو جلا بخشی۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "سلسلہ قادریہ کی نسبت وہ سہارا ہے جو دنیا و آخرت کی تمام منزلوں کو آسان کر دیتا ہے"۔

توکل اور استغناء کا عملی نمونہ

حضرت فریدِ ملت کی زندگی کا ایک اور خاصہ ان کا توکل اور استغناء تھا۔ آپ نے کبھی دنیاوی آسائشوں کے لیے اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ آپ کے پاس جب کبھی بڑے بڑے دنیادار لوگ آتے، تو آپ ان کے مرتبے سے مرعوب ہونے کے بجائے حق بات دوٹوک انداز میں بیان کر دیتے۔ آپ کا ماننا تھا کہ جو ربِ کائنات کے سامنے جھک جاتا ہے، اسے پھر کسی اور کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہی وہ استغناء تھا جس نے آپ کی شخصیت میں وہ رعب اور ہیبت پیدا کر دی تھی کہ بڑے بڑے اہلِ اقتدار بھی آپ کا ادب واحترام ملحوظ رکھتے تھے۔

حضرت فریدِ ملت کی درویشی کا عالم یہ تھا کہ آپ کے پاس دنیا چل کر آتی تھی مگر آپ نے کبھی اسے اپنے دل میں جگہ نہ دی۔ آپ کا زہد اور تقویٰ اس قدر بلند تھا کہ آپ مشتبہ مال تو دور کی بات، مباحات میں بھی انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ آپ کے مطب میں بڑے بڑے امراء اور عہدیدار آتے، لیکن آپ کی نظر کبھی ان کے مال و منال پر نہ پڑتی۔ آپ کی زندگی سادگی کا ایک ایسا نمونہ تھی جو دورِ صحابہ کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ آپ نے کڑے معاشی حالات میں بھی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ ہی اپنے وقار پر آنچ آنے دی۔ آپ کا توکل اس درجے پر تھا کہ آپ فرماتے تھے، "رزق کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اس لیے اس کی فکر میں اپنے مقصد کو نہیں بھولنا چاہیے"۔

☆ آپ کا عوامی مزاج انتہائی مشفقانہ تھا۔ آپ کی مجلس میں غریب وامیر کی کوئی تمیز نہ تھی۔ آپ ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق نہیں بلکہ اپنی ظرف کے مطابق پیش آتے تھے۔ آپ کی گفتگو میں عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر کوئی سائل یا مریض تند خوئی سے بھی پیش آتا تو آپ اسے مسکرا کر جواب دیتے اور اس کی تلخی کو اپنی شفقت سے دھو دیتے۔ آپ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ آپ کا دروازہ ہر ضرورت مند کے لیے چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ آپ کے اسی اخلاقِ کریمانہ کی وجہ سے لوگ جوق در جوق آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کو اپنا مسیحا تسلیم کرتے تھے۔

☆ ایک سربراہِ خاندان کے طور پر فریدِ ملت کا کردار انتہائی مثالی تھا۔ آپ نے اپنے گھر کو ایک علمی وروحانی درسگاہ بنا دیا تھا۔ آپ اپنی اولاد کے ساتھ نہ صرف شفیق تھے بلکہ ان کے بہترین دوست اور رہنما بھی تھے۔ آپ نے گھر کے ماحول میں نظم وضبط اور دینی شعور کو اس طرح سمویا تھا کہ بچوں کی تربیت خود بخود ہوتی چلی گئی۔ آپ کی دور اندیشی کا عالم یہ تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے (شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری) کی علمی آبیاری کے لیے نہ صرف بہترین اساتذہ کا انتخاب کیا بلکہ خود بھی ان کے علمی

مباحث میں شریک ہوتے۔ آپ کی خانگی زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ایک کامیاب انسان وہی ہے جس کا کردار اس کے گھر والوں کی نظر میں بھی معتبر ہو۔

تحریکِ پاکستان میں مثالی کردار اور قومی اعتراف

حضرت فریدِ ملتؒ کی شخصیت کا ایک نہایت اہم پہلو "تحریکِ پاکستان" میں ان کا مجاہدانہ کردار ہے۔ ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں نہ صرف علمی سطح پر حصہ لیا بلکہ عملی طور پر بھی اس قافلے کے شریکِ سفر رہے۔ آپ کی ان خدمات کے صلے میں فروری 2022ء میں صدرِ پاکستان کی جانب سے آپ کو بعد از مرگ "گولڈ میڈل" سے نوازا گیا، جو اس بات کی تصدیق ہے کہ آپ صرف ایک طبیب اور درویش ہی نہیں تھے بلکہ ایک سچے محبِ وطن اور دو قومی نظریے کے علمبردار بھی تھے۔ تحریکِ آزادی کے دوران آپ کی سیاسی بصیرت اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آپ کی کوششیں تاریخ کا وہ روشن باب ہیں جو نئی نسل کے لیے جذبۂ حب الوطنی کا سرچشمہ ہیں۔

تحریکِ احیائے دین: ایک خاموش انقلابی جدوجہد

حضرت فریدِ ملت کی بصیرت محض اپنے دور کے مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ وہ امتِ مسلمہ کے مستقبل پر نظر رکھتے تھے۔ آپ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ مسلمان قوم جب تک علمی اور فکری طور پر بیدار نہیں ہو گی، وہ غلامی اور زوال کی زنجیریں نہیں توڑ سکے گی۔ آپ کی جدوجہد شور و غوغا سے پاک تھی۔ آپ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک ایسی شخصیت تیار کی جس کے ذریعے اسلام کا حقیقی اور پرامن چہرہ دنیا کے سامنے آیا۔

حضرت فریدِ ملت ایک ایسے دور اندیش انسان تھے جنہوں نے اپنے فرزند کی صورت میں امت کو ایک ایسا قائد دیا جس نے پوری دنیا میں اسلام کے فکری دفاع کا محاذ سنبھالا۔ آپ کی یہ خاموش محنت اور خلوص ہی تھا جس نے ایک ایسے پودے کی آبیاری کی جو آج ایک تناور درخت بن کر پوری دنیا کو سایہ فراہم کر رہا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں جو بیج بوئے تھے، ان کی فصل آج علمی اور روحانی انقلاب کی صورت میں موجود ہے۔

آپ نے اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ سے یہ جان لیا تھا کہ امتِ مسلمہ کو ایسے قائدین کی ضرورت ہے جو علمِ قدیم اور علمِ جدید کے جامع ہوں۔ آپ کی دور اندیشی نے جس پودے کی آبیاری کی، اس نے آج ایک ایسی تناور شاخ کی شکل اختیار کر لی ہے جو مشرق سے مغرب تک علم کی روشنی پھیلا رہی ہے۔

حضرت فریدِ ملتؒ کی اپنے بیٹے کی تربیت محض اتفاقیہ نہیں تھی، بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے الہامی مشن کا حصہ تھی۔ شیخ الاسلام کی ولادت سے قبل اور بچپن میں حضرت فریدِ ملتؒ کو کئی ایسی بشارتیں اور خواب ملے تھے جنہوں نے انہیں یہ باور کرادیا تھا کہ یہ بچہ امتِ مسلمہ کے لیے کسی بڑے کام کا انتخاب ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی صورت میں ایک ایسی "خشتِ اول" تیار کرنے کا ارادہ کیا جو عصرِ حاضر کی احیائی تحریکوں کی بنیاد بن سکے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس بچے کو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

حضرت فریدِ ملتؒ کی تربیت کا منفرد پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو صرف روایتی دینی علوم تک محدود نہیں رکھا اور نہ ہی صرف جدید دنیاوی تعلیم پر اکتفا کرنے دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی علمی بنیادوں میں درسِ نظامی، حدیث، تفسیر اور تصوف کے ساتھ ساتھ قانون، عمرانیات اور جدید سائنسی علوم کو اس طرح سمو دیا کہ وہ ایک ایسی جامع شخصیت بن کر ابھریں جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کو مطمئن کر سکے۔ آپ خود ان کے علمی مباحث میں شریک ہوتے اور ان کے استدلال کی نوک پلک سنوارتے، جس نے ان کے اسلوبِ بیان میں وہ کاٹ پیدا کی جو آج پوری دنیا میں جانی جاتی ہے۔

تربیت کا سب سے اہم رخ "روحانی بالیدگی" تھا۔ حضرت فریدِ ملتؒ نے اپنے فرزند کی پوروں میں تسبیح کے دانوں کی محبت اور دل میں عشقِ رسول ﷺ کی شمع بچپن ہی میں روشن کر دی تھی۔ وہ انہیں راتوں کو اٹھا کر عبادت کی عادت ڈالتے اور حضور غوثِ الثقلینؒ کی نسبت سے جوڑتے۔ انہوں نے سکھایا کہ علم بغیر عمل اور بغیر عشق کے صرف ایک بوجھ ہے؛ اصل شے وہ "حضوریت" ہے جو انسان کو اپنے خالق اور اس کے رسول ﷺ کے قریب کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شیخ الاسلام کی دعوت کا مرکز و محور صرف علم نہیں بلکہ "عشقِ مصطفیٰ ﷺ" ہے۔

حضرت فریدِ ملتؒ نے اپنے بیٹے کو سکھایا کہ بڑی منزلوں کے مسافر چھوٹی آسائشوں میں نہیں الجھتے۔ انہوں نے ان کی تربیت میں "ایثار اور توکل" کا عنصر اس قدر راسخ کر دیا تھا کہ انہوں نے کبھی مادی وسائل کی کمی کو اپنے مشن میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ آپ کی دور اندیشی کا عالم یہ تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کو ان اساتذہ اور شیوخ کی صحبت میں بٹھایا جو علم و تقویٰ کے مینار تھے، تاکہ وہ اپنے کردار میں بھی ان کی جھلک پیدا کر سکیں۔ آپ کی یہ تربیت اس "خود سازی" کی بہترین مثال تھی جس نے آگے چل کر "عہد سازی" کا فریضہ انجام دیا۔

اگر حضرت فریدِ ملتؒ کی پوری زندگی کی خدمات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ان کے بیٹے کی تربیت کو دوسرے میں، تو تربیت کا پلڑا بھاری نظر آئے گا۔ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دراصل حضرت فریدِ ملتؒ کی ان تمام دعاؤں، تڑپ اور محنت کا زندہ جاوید ثمر ہیں جو انہوں نے تنہائیوں میں اپنے رب سے مانگی تھیں۔ آپ نے ایک ایسا مسیحا امت کو عطا کیا جس نے فکری انحطاط کا علاج کیا اور امتِ مسلمہ کے مردہ دلوں میں دوبارہ جینے کی امنگ پیدا کر دی۔

ایک زندہ جاوید فکری تسلسل

حضرت فریدِ ملت کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ان کا مشن ان کے وصال کے ساتھ ختم نہیں ہوا، بلکہ ان کے فرزندِ ارجمند شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی شکل میں ایک ایسے عالمی انقلاب کی صورت اختیار کر گیا جس کی نظیر دورِ حاضر میں نہیں ملتی۔ تحریکِ منہاج القرآن، فریدِ ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور منہاج یونیورسٹی جیسے ادارے دراصل اسی "فریدِ ملت" کے خواب کی تعبیر ہیں جو انہوں نے اپنی سحر خیزیوں اور دعاؤں میں دیکھا تھا۔ آج دنیا بھر میں پھیلا ہوا منہاج القرآن کا نیٹ ورک ان کے خلوص اور ان کی پاکیزہ تربیت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ انہوں نے جو پودا لگایا تھا، وہ آج ایک ایسا شجرِ سایہ دار بن چکا ہے جس کا پھل پوری دنیا کے مسلمان کھا رہے ہیں۔

حاصلِ کلام

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اگر انسان کے ارادے سچے ہوں اور اس کی بنیاد عشقِ رسول ﷺ اور خدمتِ خلق پر ہو، تو وہ تنِ تنہا ایک پوری نسل کا رخ موڑ سکتا ہے۔ وہ ایک ایسی شمع تھے جو خود تو خاموشی سے پگھلتی رہی لیکن اپنے ارد گرد کے ماحول کو روشن کر گئی۔ ان کا علمی اسلوب، ان کا عوامی مزاج، ان کی طبّی مہارت اور ان کا روحانی مقام—یہ سب مل کر ایک ایسی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں جو رہتی دنیا تک طالبانِ حق کے لیے رہنمائی فراہم کرتی رہے گی۔

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایک انسان اگر اپنے رب سے سچا تعلق استوار کر لے اور مخلوقِ خدا کے لیے سراپا رحمت بن جائے، تو زمانہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ کی زندگی علم، عمل، عشق اور اخلاق کا وہ مرقع تھی جس کی ضیا پاشیاں آج بھی جاری ہیں۔ آپ کے چھوڑے ہوئے نقوشِ قدم آنے والے مسافروں کے لیے نشانِ منزل ہیں اور آپ کی یاد دلوں کو گرمانے کا ایک دائمی ذریعہ ہے۔

آپ کی زندگی جہاں طب و حکمت کا شاہکار تھی، وہاں عشق و مستی اور زہد و تقویٰ کا حسین مرقع بھی تھی۔ آپ نے علم و عمل کے جو چراغ روشن کیے، وہ آج بھی امتِ مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ کی شخصیت کا اصل پیغام یہی ہے کہ انسان اپنے رب اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری کا رشتہ استوار کر لے، تو دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں اس کے قدم چومتی ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت فریدِ ملتؒ کی زندگی کا کینوس بہت وسیع تھا۔ آپ ایک کامیاب معالج، ایک مجاہد تحریکِ پاکستان، ایک سیاحِ عالمِ اسلام اور ایک عظیم عالم تھے۔ آپ نے جس محنت سے اپنے فرزند کی تربیت کی اور جس اخلاص سے ملتِ اسلامیہ کی خدمت کی، اس کا اعتراف آج دنیا کے 90 سے زائد ممالک میں پھیلی ہوئی ان کی فکری تحریک کی صورت میں موجود ہے۔ آپ کی زندگی اس بات کی دلیل ہے کہ جب علم، عمل اور عشق یکجا ہو جائیں تو وہ ایک ایسی شخصیت بناتے ہیں جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ کی داستانِ حیات محض ماضی کا ایک قصہ نہیں بلکہ مستقبل کا ایک نقشہ ہے۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو — چاہے وہ طب کی مسیحائی ہو، خاندانی تربیت ہو، تحریکِ آزادی کی جدوجہد ہو یا عشقِ رسول ﷺ کی تڑپ — ایک ایسی اکائی بن کر ابھرتا ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ سچی عظمت صرف عہدوں میں نہیں بلکہ کردار کی بلندی میں پوشیدہ ہے۔ آپ تاریخ کے وہ منفرد مسافر تھے جنہوں نے اپنی منزل خود متعین کی اور رہتی دنیا تک کے لیے نشانِ منزل چھوڑ گئے۔

ماہنامہ منہاج القرآن

فی شمارہ: 60 روپے
سالانہ خریداری: 700 روپے

اپنے علاقے میں موجود پبلک لائبریریز، کالجز، سکولز، عوامی مقامات، دوست احباب اور علاقے کی موثر شخصیات کو سالانہ خریداری کی صورت میں تحفہ بھجوائیں

365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 042-111-140-140 Ext: 128
0300-8886334 Whatsapp: 0300-8105740
Web:www.minhaj.info Email:mqmujallah@gmail.com

رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ (2026ء)

شیخ الاسلام کے حضور نبی اکرم ﷺ کے اَخلاقِ کریمانہ کے موضوع پر اَخلاقی و روحانی خطابات

خصوصی رپورٹ

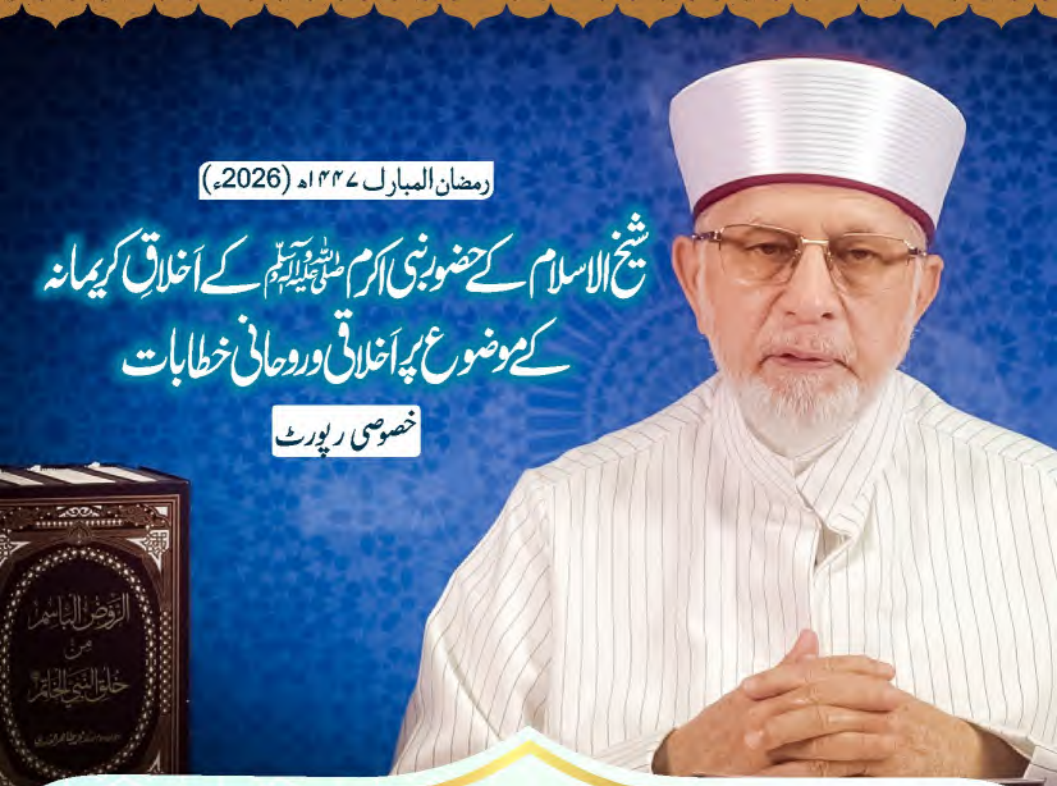

ماہِ رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ (2026ء) کے آخری عشرہ میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ کے موضوع پر اخلاقی و روحانی خطابات ارشاد فرمائے۔ ان فکر انگیز اور روح پرور مجالس میں حضور نبی اکرم ﷺ کے اَخلاقِ کریمانہ کی روشنی میں ہمارے شخصی، خاندانی اور سماجی و معاشرتی رویوں کو سنوارنے کا لائحہ عمل نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا۔

یہ تمام خطابات شیخ الاسلام کے فیس بک پیج اور یوٹیوب چینل، منہاج ٹی وی اور ڈِسکور پاکستان پر براہِ راست نشر کیے گئے جنہیں منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ، مرکزی تعلیمی ادارہ جات، مراکزِ علم، ضلعی مراکز، نظام المدارس کے ہزاروں مدارس، ملک بھر کی مساجد اور بیرونِ ملک اسلامک سنٹرز میں لاکھوں افراد نے براہِ راست دیکھا۔ ان تربیتی خطابات کو رفقاء و کارکنان تحریک اور عامۃ الناس کی اکثریت نے اپنی فیملی اور دوستوں کے ساتھ مل کر دیکھا تاکہ حضور نبی اکرم ﷺ کے اَخلاقِ کریمانہ کی روشنی میں وہ اپنی زندگیوں میں سکون اور معاشرے میں مثبت اقدار کو فروغ دے سکیں۔ مجدد المئۃ الحاضرہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت کے یہ خطابات ان کی کتاب "اَلرَّوْضُ الْبَاسِم مِنْ خُلُقِ النَّبِيِّ الْخَاتِمِ ﷺ (حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ) میں مذکورہ احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہوئے۔

ان تمام روحانی و تربیتی نشستوں میں چیئرمین سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، خرم نواز گنڈاپور ناظم اعلیٰ منہاج القرآن انٹرنیشنل، سی ای او ڈسکور پاکستان ڈاکٹر قیصر رفیق، صدر منہاج القرآن ویمن لیگ ڈاکٹر غزالہ قادری، محترمہ فضہ حسین قادری سمیت نائب ناظمین اعلیٰ، مرکزی سربراہان شعبہ جات و فورمز، علماء و مشائخ اور عامۃ الناس خواتین و حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

ذیل میں ان خطابات کے خلاصہ جات نذرِ قارئین ہیں:

۱۔ 20ویں رمضان المبارک (10 مارچ 2026ء): پہلی نشست

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے ''حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ'' کے موضوع پر منہاج القرآن انٹرنیشنل کے سیکرٹریٹ ماڈل ٹاؤن لاہور پر منعقدہ پہلی اخلاقی و تربیتی مجلس سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ انسانیت کے لیے سب سے بڑا عملی معجزہ ہے اور آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو انسان کو اعلیٰ اخلاق، کردار اور خدمتِ خلق کا درس دیتا ہے، امّ المؤمنین حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے تاریخی بیان کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں کہا کہ یہ سیرتِ نبوی ﷺ کے بارے میں تاریخِ انسانیت کی اوّلین معتبر شہادت ہے۔ یہ محض تسلی

کے الفاظ نہیں تھے بلکہ حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے طویل مشاہدے پر مبنی ایک جامع گواہی تھی، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کی کامیابی کا یقین سات اخلاقی اوصاف کی بنیاد پر ظاہر کیا، جن میں صلہ رحمی، سچائی، کمزوروں کی مدد، محتاجوں کی کفالت، مہمان نوازی اور حق کے راستے میں مصیبت زدہ لوگوں کی مدد شامل ہیں۔

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان دراصل سیرتِ محمدی ﷺ کا پہلا جامع تعارف ہے اور اگر سیرتِ طیبہ کو ایک کتاب سمجھا جائے تو یہ بیان اس کتاب کی ''سورۂ فاتحہ'' کی حیثیت رکھتا ہے، جس طرح قرآن مجید کی ابتداء سورۃ الفاتحہ سے ہوتی ہے اسی طرح سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سات جملے سیرتِ نبوی ﷺ کے بنیادی اخلاقی اصولوں کو واضح کرتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ انسان کو انا پرستی سے نکال کر بندگی، عاجزی اور اجتماعیت کا درس دیتی ہے جبکہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بیان کردہ اوصاف بھی ایسے ہیں جن کا تعلق دوسروں کی خدمت اور بھلائی سے ہے نہ کہ ذاتی مفاد سے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت بذاتِ خود ایک عظیم معجزہ ہے۔ جس طرح قرآن مجید کے بارے میں چیلنج دیا گیا کہ اس جیسی ایک سورت پیش کر کے دکھائی جائے، اسی طرح حضور ﷺ کی چالیس سالہ سیرت اہلِ مکہ کے سامنے بطور دلیل پیش کی گئی۔ چودہ سو سے زائد برس گزرنے کے باوجود نہ قرآن کی مثل کوئی کلام پیش کیا جا سکا اور نہ ہی سیرتِ محمدی ﷺ جیسا کردار دنیا میں سامنے آ سکا، اللہ تعالیٰ نے اعلانِ نبوت سے پہلے چالیس برس تک حضور ﷺ کی سیرت کو بطور دلیل دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ جب دعوتِ توحید دی جائے تو لوگ اس کے پیچھے موجود کردار کی سچائی کو دیکھ سکیں۔ ان کے مطابق دعوت کی اصل قوت الفاظ نہیں بلکہ کردار کی سچائی ہوتی ہے۔

۲۔21 رمضان المبارک (11 مارچ 2026ء): دوسری نشست

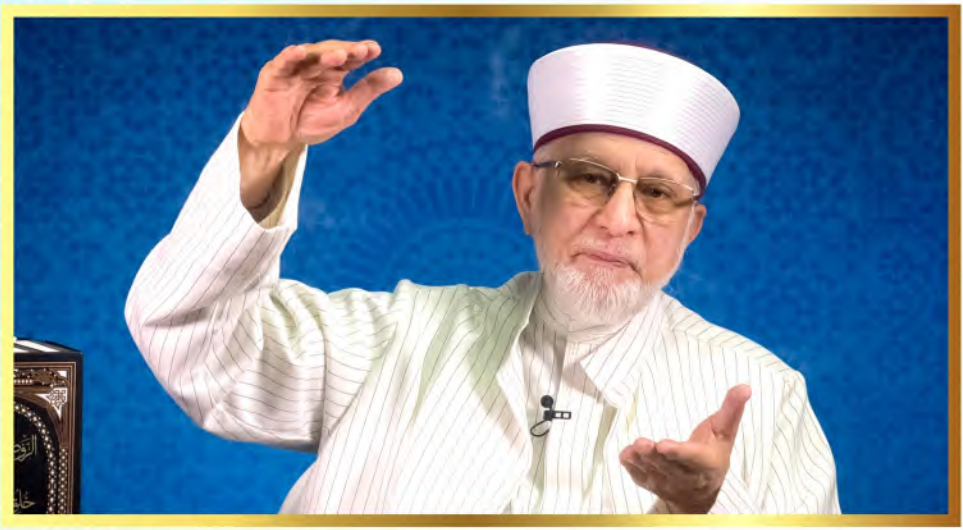

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے منہاج القرآن انٹرنیشنل سیکرٹریٹ پر منعقدہ اخلاقی و روحانی تربیتی مجالس کی دوسری نشست میں ”حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ“ کے موضوع پر خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ انسانیت کے لیے مثالی نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے ہر عمل میں صبر، درگزر، محبت، خدمتِ خلق اور صلۂ رحمی کے عملی اسباق پیش کیے ہیں۔ جو شخص خدمت خلق میں مصروف ہو جائے، اسے کسی خیر سے محروم نہیں رکھتا، اسے عزت اور وقار دیتا ہے اور اسے دائمی و باطنی مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔

انہوں نے داعیانِ دین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج کا المیہ یہ ہے کہ ہم دین کی دعوت تو دیتے ہیں مگر اپنے کردار اور اخلاق سے اس کی عملی دلیل پیش نہیں کرتے۔ قرآن نے دعوت کا اصول

واضح کیا ہے کہ لوگوں کو حکمت اور بہترین انداز میں اللہ کی راہ کی طرف بلایا جائے، اگر داعی کے لہجے میں نفرت، سختی اور بد تہذیبی ہو تو ایسی دعوت لوگوں کے دلوں میں اثر پیدا نہیں کرتی۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی دعوت رحمت، محبت اور اعلیٰ اخلاق پر مبنی تھی، اسی لیے وہ دلوں کو فتح کرتی تھی۔

قرآن مجید اور سیرتِ نبوی ﷺ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے محفوظ معجزات ہیں۔ قرآن الفاظ کی صورت میں محفوظ ہے جبکہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ عملی زندگی کی صورت میں انسانیت کی رہنمائی کرتی ہے اور قیامت تک ہدایت کا کامل سرچشمہ رہے گی۔

سارے تصوف اور روحانیت کا خلاصہ فتوت ہے، اور فتوت کا نقطۂ کمال یہ ہے کہ انسان اپنی ذات، نفس اور انا کے دائرے سے باہر نکل کر مخلوقِ خدا کے لیے جیئے۔ جب بندہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بندوں کی فکر کرتا ہے، اُن کے کاموں میں مصروف ہوتا ہے تو وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے، ایسے شخص کو اللہ رب العزت رسوائی، بیچارگی اور بے توقیری سے بچاتا ہے اور اسے اللہ کی رحمت ہر وقت سنبھالے رکھتی ہے۔ خدمت خلق اور انسانیت پروری سے انسان کا باطن مضبوط ہوتا ہے، جو لوگ دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی کا ذریعہ بنتے ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ باطن کی مضبوطی عطاء کرتا ہے۔

۳۔22 رمضان المبارک (12 مارچ 2026ء): تیسری نشست

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے اخلاقی و روحانی تربیتی مجالس ”حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ“ کی تیسری نشست سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے اصحابِ کہف کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ چند نوجوان ظلم و جبر سے بچنے کے لیے اللہ کی رضا کے لیے غار میں پناہ لیتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی ہوتا ہے جو غار کے دروازے پر پہرہ دیتا ہے۔ شیخ الاسلام نے اس واقعہ سے اخلاقی سبق اخذ کیا کہ نیک لوگوں کی صحبت انسان کی زندگی بدل سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نیک بندوں کی نسبت سے ہر مخلوق کو عزت اور مقام عطا فرماتا ہے۔

انہوں نے صوفیاء کرام، خصوصاً حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رضی اللہ عنہ کی تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جیسے پالتو جانور اپنے مالک کے ساتھ وفادار رہتا ہے، اسی طرح انسان کو اپنے رب اور نیک لوگوں کے ساتھ وفاداری اور اخلاص اختیار کرنا چاہیے۔ جانور بھی بعض اوقات اخلاقی رویے اختیار کرتے ہیں، مثال کے طور پر مردار کے پاس جمع ہونے والے جانور ایک دوسرے کے حق کا خیال رکھتے ہیں، اور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے دوسروں کے حقوق اور اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور رکھنا چاہیے۔

شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ نے صلۂ رحمی، رشتہ داروں کے حقوق اور معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ بڑوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت، رشتہ داروں کی مدد اور ان کی

غلطیوں کو معاف کرنا انسان کی شخصیت کو سنورتا ہے اور معاشرتی برکت پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بیان کردہ روایت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سچ بولنا، کمزوروں کی مدد، مہمان نوازی، نیکی میں تعاون اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا مسلمانوں کے لیے اخلاقی اصول ہیں۔ انسان میں انا، خود پسندی، ریاکاری، حسد اور تکبر جیسے قلبی و ذہنی مسائل کا علاج حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر عمل، محاسبۂ نفس، عاجزی، اخلاص اور صالحین کی صحبت اختیار کرنا ہے۔

انہوں نے میاں بیوی کے حقوق اور خوشگوار ازدواجی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی، اور کہا کہ شادی میں محبت، احترام، افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری بنیادی اصول ہیں۔ بچوں کی تربیت میں والدین کے کردار پر زور دیتے ہوئے شیخ الاسلام نے کہا کہ والدین کی محبت، شفقت اور اعلیٰ اخلاق خاندان میں صحت مند معاشرتی نظام قائم کرتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاق، صلۂ رحمی، خدمتِ خلق، عاجزی اور اخلاص کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا انسان کی شخصیت کو سنورتا ہے اور معاشرہ بھی محبت، امن اور خیر خواہی کا گہوارہ بنتا ہے۔

۴۔23 رمضان المبارک (13 مارچ 2026ء): چوتھی نشست

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے ان علمی و فکری مجالس کی چوتھی اخلاقی و روحانی تربیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح قرآن مجید کے معانی و معارف کی کوئی

حد نہیں اسی طرح حدیثِ نبوی بھی ایک بحرِ بیکراں ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ انسان کس قدر گہرائی کے ساتھ اس کے اندر اترتا ہے۔

حدیثِ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی روشنی میں سیرت النبی ﷺ پر گفتگو کرتے ہوئے شیخ الاسلام نے صلہ رحمی کرتے ہیں۔ صلۂ رحمی کے لسانی، سماجی، اخلاقی، نفسیاتی اور عملی پہلوؤں کے علاوہ اس کے روحانی اور باطنی معانی بھی ہیں۔ صلۂ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ انسان نہ صرف خونی رشتوں کو مضبوط کرے بلکہ معاشرے میں محبت اور تعلقات کو بھی مضبوط بنائے، رحم کا بنیادی معنی ماں کا رحم ہے جہاں سے انسان کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی مختلف قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں جیسے سماعت، بصارت، حافظہ، جذبات اور مختلف میلانات۔ یہ سب ایک ہی اصل سے پیدا ہوتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف مراحل میں بکھر جاتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کا کمال یہ ہے کہ آپ نہ صرف لوگوں کے درمیان ظاہری تعلقات کو جوڑتے ہیں بلکہ انسان کے باطن اور اندرونی دنیا کو بھی یکجا کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ کی نگاہِ نبوت انسان کے بکھرے ہوئے باطن کو بھی ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہے۔

آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ظاہر میں تو ایک نظر آتا ہے مگر باطن میں منتشر ہے۔ آنکھ کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے، کان کچھ اور سننا چاہتے ہیں، دل کسی اور طرف مائل ہوتا ہے اور ذہن کسی اور سمت میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔ یہ باطنی انتشار دراصل روحانی کمزوری کی علامت ہے۔

حقیقی صلۂ رحمی یہ ہے کہ انسان کے اندر موجود تمام قوتیں، رجحانات اور خواہشات ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور وہ مرکز اللہ تعالیٰ کی رضا ہو۔ جب انسان کا دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور عقل، دل اور نفس سب اسی مقصد کے تابع ہو جائیں تو انسان کے اندر وحدت پیدا ہو جاتی ہے، حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اس وحدتِ باطن کی کامل مثال ہے۔ آپ ﷺ کی خواہشات، ترجیحات، محبت، خوف اور امید سب کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ذات مبارکہ ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے کامل ہم آہنگی کا نمونہ ہے۔ جب انسان کے دل و دماغ میں یہ وحدت پیدا ہو جائے تو اس کی سماعت، بصارت، عقل اور نفس سب اللہ کی اطاعت کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کی پوری باطنی دنیا اللہ کی عبادت اور اطاعت کی گواہی دینے لگتی ہے۔

۵۔24 رمضان المبارک (14 مارچ 2026ء): پانچویں نشست

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے ''حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ'' کے عنوان سے منعقدہ پانچویں اخلاقی و روحانی تربیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کی باطنی اور روحانی زندگی کی اصل بنیاد رحمت، محبت اور شفقت ہے، اور رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ان اوصاف کا کامل مظہر ہے۔ آپ ﷺ نے انسانیت کو سکھایا کہ حقیقی کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی اندرونی دنیا کو رحمت اور محبت کے رشتے سے جوڑ لے۔ لفظ ''رحم'' اور ''رحمت'' کا مفہوم صرف ظاہری مہربانی نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے اور انسان کے اندر

موجود انتشار کو ختم کرنے کا نام ہے۔ انسان کی باطنی دنیا میں اکثر تضادات اور کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ خواہشات، جذبات اور مختلف رجحانات آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ ان تمام متضاد قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا اور انہیں محبت و شفقت کے رشتے میں باندھنا دراصل رحمت کا عملی مظہر ہے۔

انسان کے اندر جتنا زیادہ غصہ، سختی اور نفرت ہو گی، اتنا ہی وہ رحمت کے سرچشمے سے دور ہوتا جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے غصے کو ٹھنڈک میں، نفرت کو محبت میں اور سختی کو نرمی میں بدل دے۔ یہ عمل خود بخود پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے محاسبۂ نفس اور مراقبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک انسان اپنی زبان، لہجے اور طبیعت کو نرم نہیں کرتا، اس وقت تک وہ وحدت اور محبت کے نتائج حاصل نہیں کر سکتا، اگر انسان کی اندرونی قوتیں اپنے اصل مرکز یعنی رحمت سے کٹ جائیں تو معاشرے میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقات ـــــ علما، اساتذہ، قائدین اور کارکن اکثر انا اور نفس پرستی کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔ جب دل رحمت کے مرکز سے کٹ جاتا ہے تو زبان دوسروں کے دل زخمی کرنے لگتی ہے اور انسان مکر و فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا تعارف سورۃ الفاتحہ میں ''الرحمن الرحیم'' کے الفاظ سے کروایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے وجود میں اللہ کے ساتھ تعلق کی جو صلاحیت رکھی گئی ہے وہ بھی رحمت پر مبنی ہے۔ جب انسان اللہ سے جڑ جاتا ہے تو اس کے اندر وحدت پیدا ہو جاتی ہے اور شرک و انتشار ختم ہو جاتا ہے، انسان کے باطن میں تین بنیادی عناصر ہیں: نفس، قلب اور عقل۔ جب یہ تینوں ایک مضبوط رشتے میں جڑ جائیں تو انسان کی شخصیت مضبوط ہو جاتی ہے اور بیرونی فتنوں کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ باطنی رشتہ کمزور ہو جائے تو بیرونی عوامل انسان کو آسانی سے متاثر کر لیتے ہیں۔

بد قسمتی سے آج ہماری معاشرتی اور مذہبی زندگی میں اتحاد کی وہ کیفیت نہیں رہی جو ہونی چاہیے۔ دنیا کے موجودہ حالات میں ہر طرف انتشار اور آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی حالات کو شاید ہم فوری طور پر تبدیل نہ کر سکیں، لیکن کم از کم ہمیں اپنی اندرونی اصلاح ضرور کرنی چاہیے۔ جب انسان کے اندر صلہ رحمی اور خیر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات پورے معاشرے تک پہنچتے ہیں۔

ہر انسان کے اندر خیر اور بھلائی کا ایک سرچشمہ ہے۔ دنیاوی خواہشات اور نفسانی تقاضے اس سرچشمے کو خشک کر دیتے ہیں۔ اس لیے انسان کو اپنے باطن کی طرف لوٹنا ہو گا اور اسے دوبارہ زندہ کرنا ہو گا تاکہ خیر اور محبت کی بارش نصیب ہو، جب انسان غفلت کی نیند سے بیدار ہوتا ہے اور اپنے اندر کی حقیقت کو پہچان لیتا ہے تو یہی بیداری اس کے روحانی سفر کی ابتدا بن جاتی ہے۔ صلہ رحمی صرف ایک

وقتی عمل نہیں بلکہ ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ نفس انسان کو بار بار اپنی طرف کھینچتا ہے، دنیا اپنی طرف بلاتی ہے، مگر سالک کو ہر مرتبہ اپنے قبلہ کی طرف لوٹنا ہوتا ہے۔

جیسے کوئی شخص لاہور سے کراچی سفر کرنا چاہے تو اسے درمیان کے تمام اسٹیشنوں سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرح روحانی سفر بھی مرحلہ وار طے ہوتا ہے۔ جب انسان کے رشتے منقطع ہو جاتے ہیں تو وہ روحانی طور پر مردہ ہو جاتا ہے، اور جب اللہ سے جڑ جاتا ہے تو دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ آج ہماری ترجیحات الٹ گئی ہیں۔ جس چیز کو مقدم ہونا چاہیے تھا اسے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ نفس کو نیچے ہونا چاہیے تھا مگر اسے تخت پر بٹھا دیا گیا ہے اور دل کو قید کر دیا گیا ہے۔ اصل ترتیب یہ ہے کہ دل مرکز بنے، عقل اس کی معاون ہو اور نفس تابع ہو۔ جب یہ ترتیب درست ہو جاتی ہے تو انسان کے اندر نرمی، محبت اور ذکرِ الٰہی کی دائمی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۶۔25 رمضان المبارک (15 مارچ 2026ء): چھٹی نشست

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے مرکزی سیکرٹریٹ پر رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں ''حضور نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ'' کے موضوع پر منعقدہ چھٹی اخلاقی و روحانی تربیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے کہا کہ حضور نبی

اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ہر پہلو انسانیت کے لئے کامل رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ آپ ﷺ کی مبارک حیاتِ طیبہ سچائی، امانت، رحم، محبت اور اعلیٰ اخلاق کا ایسا عملی نمونہ ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مشہور حدیثِ خدیجہ میں ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی جن عظیم صفات کا ذکر کیا، ان میں ایک بنیادی وصف ''صدق الحدیث'' یعنی ہمیشہ سچ بولنا ہے۔ شیخ الاسلام نے واضح کیا کہ سچ بولنا اور بات ہے جبکہ سچائی کا پیکر بن جانا ایک بلند تر مقام ہے، صداقت محض ایک اخلاقی خوبی نہیں بلکہ یہ انسان کی پوری شخصیت کا مرکز ہے۔ صدق کا مطلب یہ ہے

کہ انسان کے ظاہر و باطن، دل و دماغ اور زبان و عمل میں کوئی تضاد باقی نہ رہے۔ جب انسان کی شخصیت کے تمام پہلو ایک ہی حقیقت یعنی سچائی پر جمع ہو جائیں تو اسے حقیقی صداقت کہا جاتا ہے۔

دینِ اسلام میں روحانیت کی بنیاد مقامِ صدق ہے۔ نیکی، خیر، اخلاص اور تمام اخلاقی خوبیاں اسی سرچشمۂ صدق سے پھوٹتی ہیں۔ اگر انسان جھوٹ کا عادی ہو تو اس کی دیگر نیکیاں بھی اپنی تاثیر کھو دیتی ہیں۔ اس لئے اخلاقیات کا مسلمہ اصول ہے کہ سچائی تمام نیکیوں کی جڑ ہے، جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اور جھوٹ سے مکمل اجتناب کرتا ہے، اس کی شخصیت میں تضاد ختم ہو جاتا ہے اور وہ سچائی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت الحق کا مظہر بننے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ انسان کے اندر بے سکونی، اضطراب اور تضاد پیدا کر دیتا ہے۔

سماجیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اعتماد (Trust) کسی بھی معاشرے کا سب سے بڑا سوشل کیپیٹل ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی زندگی اس کی روشن مثال ہے کہ اعلانِ نبوت سے پہلے ہی اہلِ مکہ آپ ﷺ کو صادق و امین کے لقب سے یاد کرتے تھے کیونکہ آپ ﷺ کی سچائی اور امانت داری پر سب کو مکمل اعتماد تھا۔ انسانی دماغ کی فطری ساخت سچ بولنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ سچ بولنے سے دماغ پر کم دباؤ پڑتا ہے جبکہ جھوٹ بولنے کے لیے دماغ کو اضافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ جھوٹ بولنے والا شخص پہلے اصل حقیقت کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، پھر ایک نئی کہانی گھڑتا ہے اور اسے یاد رکھنے کے لیے مسلسل ذہنی دباؤ میں رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ذہنی تناؤ بڑھتا ہے، اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور انسان کی توجہ اور سکون ختم ہو جاتا ہے۔

سچائی انسان کو اندرونی سکون اور اعتماد عطا کرتی ہے جبکہ جھوٹ انسان کو ذہنی انتشار اور بے چینی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچائی کو سکون اور نجات کا راستہ قرار دیا ہے، جو شخص ظاہر و باطن میں سچائی کو اختیار کر لیتا ہے وہ نفسیاتی دباؤ سے آزاد ہو کر مضبوط اور بااعتماد شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور معاشرے میں اعتماد اور استحکام پیدا کرتے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے امت کو واضح ہدایت فرمائی کہ ہمیشہ سچ بولو اور سچائی کو اپنی زندگی کا شعار بناؤ۔ جب انسان کی فکر، نیت، قول اور عمل سب سچائی پر قائم ہو جائیں تو وہ صدیقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص جھوٹ کو اپنا معمول بنالے، وہ اللہ کے نزدیک کذاب شمار ہوتا ہے، مسلمان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں سچائی کو اپنائیں تاکہ ان کی شخصیت میں ظاہر و باطن کا تضاد ختم ہو اور وہ سیرتِ مصطفوی ﷺ کی حقیقی پیروی کرتے ہوئے ایک صالح اور بااعتماد معاشرہ تشکیل دے سکیں۔

7۔ 26 رمضان المبارک (16 مارچ 2026ء)

ساتویں نشست (عالمی روحانی اجتماع)

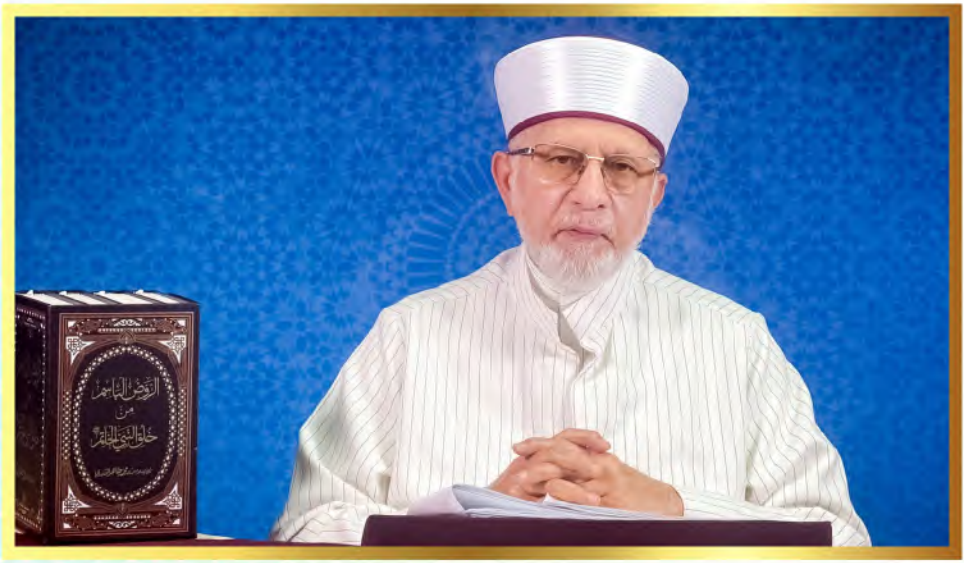

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری دامت برکاتہم العالیہ نے منہاج القرآن انٹرنیشنل کے مرکزی سیکرٹریٹ پر منعقدہ 27 ویں شبِ رمضان المبارک کے سالانہ عالمی روحانی اجتماع سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے نزولِ وحی کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جن صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا، وہ درحقیقت انسانی تاریخ میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا جامع تعارف ہے۔ ان میں سے ایک بنیادی وصف صدق الحدیث ہے، یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظاہر و باطن سراپا سچائی ہونا۔ جس طرح قرآنِ مجید کے معانی کی کوئی حد نہیں ہے، کوئی جتنا اِس میں ڈوبتا جائے گا نئے سے نئے معانی اُس پر عیاں ہوتے جائیں گے، اِسی طرح سیرتِ نبوی اور نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے درجات ہیں کہ جو جتنا اِس میں غوطہ زن ہوگا اُس پر اُتنے ہی معانی و مفاہیم کھلتے جائیں گے۔

حدیثِ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا ایک پہلو 'صدق' بیان ہوا ہے، جس کا سادہ معنیٰ ہے سچ۔ سچ بولنا ایک بات ہے اور سچا ہونا اور بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرتاپا سچائی کا پیکر ہیں۔ ہم تمام تر نقائص اور خرابیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ جو شخص خرابی کی اصل وجہ اپنے اندر تلاش کرتا ہے، وہ اپنے نفس کی اصلاح کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن جو ہر خرابی دوسروں میں ڈھونڈتا رہے، اس کے لیے اپنے نفس کی اصلاح کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ صداقت محض

ایک اخلاقی خوبی نہیں ہے، بلکہ جب انسانی وجود کے ظاہر اور باطن کے تمام گوشے ایک حق و صداقت کے مرکز پر جمع ہو جائیں تو یہ کیفیت سچائی بنتی ہے۔

دینِ اسلام میں نیت، اخلاص، روحانیت اور تمام اعمالِ صالحہ کی بنیاد صدق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ، خیر، روحانیت اور طہارت سمیت ہر بھلائی کی جڑ صدق ہی سے پھوٹتی ہے اور اسی سے انسانی کردار میں حقیقی پاکیزگی اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ وجودِ انسانی میں ہر اچھائی صداقت سے پھوٹتی ہے۔ جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اس کی طبیعت میں تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفتِ حق اس کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ سچائی تمام نیکیوں کی جڑ ہے، جو شخص جھوٹ بولتا ہے اس کی کوئی نیکی اثر پذیر نہیں ہوتی۔ ہماری عبادات بھی اسی لیے بے اثر رہتی ہیں کیونکہ شخصیت میں صداقت کی کیفیت قائم نہیں ہے۔ جو شخص زبان کا سچا ہو اس کا ضمیر بیدار رہتا ہے اور اسے معاشرتی وقار حاصل

ہوتا ہے۔ سچ جس طرح دنیاوی فوائد کا باعث ہے، اسی طرح روحانی ثمرات بھی عطاء کرتا ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ محبت اور عبادت میں سکون کا لاتا ہے۔ نیورو سائنس کے مطابق انسانی دماغ کی فطری حالت سچائی پر مبنی ہے۔ فطرت نے انسان کیلئے سچ کو آسان بنایا ہے جبکہ جھوٹ بولنے پر دماغ کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور وہ ٹربل کا شکار ہوتا ہے، جس سے اس کی صلاحیتوں میں کمی آتی ہے۔

سچ بولنا انسانی دماغ اور باطن کو راحت عطاء کرتا ہے، جبکہ جھوٹا شخص روحانی اور باطنی سکون سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے شخص کی تمام صلاحیتیں سچ چھپانے میں صرف ہو جاتی ہیں۔ سچائی ذہنی و جسمانی تناؤ سے نجات دیتی ہے، اور روحانی و قلبی سکون عطاء کرتی ہے۔ اندرونی راحت کا حامل شخص ناقابل تسخیر ہوتا ہے۔ جبکہ جھوٹ شخصیت میں تضادات لاتا ہے، یہ تضادات انسان کو ناکامیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ سچائی نیکی کی راہ دکھاتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور مستقل صداقت کی کیفیت میں رہنے والا شخص اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں سچا (صدیق) لکھا جاتا ہے۔

سچائی صرف زبان سے سچ بولنے تک محدود نہیں بلکہ انسان کی پوری شخصیت، نیت، ارادے، عمل، معاملات اور ذمہ داریوں میں سچائی کا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان کے قول، نیت، ارادہ، وعدہ، عمل اور معاملات سب سچائی پر قائم ہوں تو اسے حقیقی معنٰی میں صدق حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی اخلاقیات میں سچائی کی متعدد جہات ہیں جن میں صدق القول (بات کی سچائی)، صدق النیۃ (نیت کی سچائی)، صدق العزم (ارادے کی سچائی)، صدق الوفا (وعدہ کی پاسداری)، صدق العمل (عمل میں اخلاص) اور صدق المعاملہ (معاملات میں دیانت) شامل ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کے بغیر کامل سچائی حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید نے سچائی کے مقام کو نہایت بلند قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ رہو، کیونکہ سچوں کی صحبت انسان کو بھی سچائی کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ قیامت کے دن صرف سچائی ہی انسان کے کام آئے گی، اور ہر شخص کے اعمال اس کے سامنے واضح کر دیے جائیں گے۔ صدق محض وقتی سچ نہیں ہے بلکہ، کامل سچائی یہ ہے کہ انسان کا دل بھی سچ بولے، انسان کا نفس بھی سچ بولے، انسان کے باطن بھی سچ بولے۔ جیسے اُس کا ظاہر تمام کا تمام سچ بولتا ہے ایسے اُس کا باطن بھی سچ کا آئینہ دار ہو۔ آنکھ کی سچائی یہ ہے کہ وہ کائنات میں جس چیز کو دیکھیں اُس سے عبرت حاصل کرے۔ آنکھوں کی بصارت اگر بصیرت بن جائے تو یہ آنکھوں کی سچائی ہے۔ کانوں کی سچائی یہ ہے کہ وہ صرف حق کی آواز سنیں اور باطل کی بات کو قبول نہ

کریں۔ عقل کی سچائی یہ ہے کہ وہ جب آپ کو گائیڈ کرے تو وہ دھوکے سے پاک ہو کر آپ کو رائے دے۔ دل کی سچائی یہ ہے کہ جب وہ دوسرے کے متعلق فیصلہ کرے تو کدورت، نفرت اور حقارت و بغض کے جذبات سے خالی ہو۔ نیت کی سچائی یہ ہے کہ انسان کے عمل کا ظاہر اور باطن یکساں ہو، انسان کی نیت اُسی طرح سچی ہو جیسے اس کا عمل دیکھنے میں نظر آرہا ہے۔

ایک وقت تھا جب معاشرے کی فضا صدق، امانت اور پاکیزہ کردار سے معطّر تھی۔ آج زمانے کی رفتار نے ہمیں اُن درخشاں اَقدار سے بہت دُور اور بہت نیچے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اب اُن عظیم قدروں کی صرف مدھم سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ معاملات میں سچائی یہ ہے کہ ہر معاملے کی بنیاد سچائی، شفافیت اور ایمانداری پر ہونی چاہیے۔ ہر لین دین میں صداقت کا ہونا لازمی ہے، اور دھوکہ، فریب یا جعل سازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ سچوں اور سچائی سے محبت فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی صرف اَخلاقیات کا ایک چیپٹر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں محبوبیت کا مضمون ہے۔ سچ بولنے کا عمل انسان کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا محبوب بنا دیتا ہے۔ کوئی نیکی یا گناہ چھوٹا اور معمولی نہیں ہے۔ چھوٹی سی دیانت بھی محفوظ ہے اور چھوٹی سی خیانت بھی محفوظ ہے۔ ہماری زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔

جھوٹ انسان کے اندر بہت سی سوچوں سے جنم لیتا ہے۔ سب سے پہلا جھوٹ یہ ہے کہ انسان خود کو وہ سمجھتا ہے جو وہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہی سے جھوٹ کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ سچی عقل وہ ہے جو یہ سمجھے کہ میں ناکافی ہوں، کافی وہ فرمان ہے جو اللہ اور اُس کے رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ جو عقل وحیٔ الٰہی کے سامنے جھک جائے اور اللہ تعالیٰ کے نبی کے فرمان کے آگے جھک جائے وہ عقل سچی ہے۔ عقل عیّار اور نفس مکار ہے، اور ہماری زندگی ان دونوں کشتیوں میں سوار ہے۔ نفس اپنے ہر عیب کو سنوار کر پیش کرتا ہے اور عقل اکثر اسے تصدیق دے دیتی ہے۔ ان دونوں کے مکر و فریب سے نجات پانا ضروری ہے۔

شیخ الاسلام نے موجودہ دور کے اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں نفس کی مکاریاں اور عقل کی عیاریاں انسانی زندگی پر غالب آچکی ہیں، جس کے باعث سچائی اور دیانت جیسی اقدار کمزور ہو رہی ہیں۔ امّت مسلمہ کو سیرتِ نبوی ﷺ سے رہنمائی لے کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں سچائی کو فروغ دینا ہوگا، قیامت کے دن انسان کے اعمال کا حساب اتنی باریکی سے ہوگا کہ زمین، اعضاء اور انسان کا پورا وجود اس کے اعمال کی گواہی دے گا۔ اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ دنیا کی عارضی کامیابی کے بجائے آخرت کی دائمی کامیابی کو اپنا معیار بنائے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو اس قدر سچائی سے مزین کرے کہ لوگ اسے دیکھ کر سچائی کا مفہوم سمجھ سکیں۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی محبت، قربِ الٰہی اور آخرت کی کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

لیلۃ القدر کی مناسب سے 27 ویں شبِ رمضان المبارک کو منعقدہ اس عالمی روحانی اجتماع کے آغاز میں عظیم الشان محفلِ حسنِ قرأت و نعت بھی منعقد ہوئی جن میں قراء اور نعت خواں حضرات نے ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ اس عالمی روحانی اجتماع میں ڈاکٹر محمد فاروق رانا نے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، ڈاکٹر حسین محی الدین قادری اور شیخ حماد مصطفی مدنی القادری کی منظرِ عام پر آنے والی کتب کا تعارف پیش کیا۔ نظامتِ ایجوکیشنل اینڈ پروفیشنل ڈویلپمنٹ (EPD) اور نظامتِ تربیت کے سکالرز نے نقابت کے فرائض سرانجام دیئے۔ چیئرمین سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری، منہاج القرآن انٹرنیشنل یوکے کے سینئر بانی راہنما حاجی عبدالغفور قادری، ناظم اعلیٰ منہاج القرآن انٹرنیشنل خرم نواز گنڈاپور، صدر منہاج القرآن ویمن لیگ انٹرنیشنل ڈاکٹر غزالہ قادری، محترمہ فضہ حسین قادری، نائب ناظمین اعلیٰ تحریک، علمائے کرام و مشائخ عظام اور مرکزی قائدین تحریک منہاج القرآن و جملہ فورمز سمیت کثیر تعداد میں عوام الناس نے شرکت کی۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری اور شیخ حماد مصطفی المدنی القادری کی رمضان المبارک (2026ء) کے موقع پر نئی مطبوعہ کتب

ڈاکٹر محمد فاروق رانا
ڈائریکٹر فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور

علم کی شمع جب خلوصِ نیت سے روشن ہو تو اُس کی تابانی نسلوں کو منوّر کرتی ہے۔ تحریکِ منہاج القرآن چار نسلوں سے قرآن و سنّت کی روشنی کو ہر دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے تجدید واِحیاءِ دین کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ اِسی علم پرور روایت کے تسلسل میں ماہِ رمضان المبارک 2026ء کے آخری عشرے میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری، پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری اور شیخ حماد مصطفی المدنی القادری کی درج ذیل نئی گراں قدر تصانیف منظرِ عام پر آئی ہیں۔ یہ کتب محض تصانیف نہیں، بلکہ اُمتِ مسلمہ کے لیے فکری سرمایہ، عملی راہ نُمائی اور روحانی زادِ راہ ہیں۔

1. The Travels of Farid-e-Millat Dr. Farid-ud-Din Qadri

محسنِ تحریک، عارفِ اَسرارِ اَزل، فریدِ ملت حضرت ڈاکٹر فریدالدین قادری کثیر الجہات اور جامع الکمالات شخصیت تھے۔ علوم و فنون میں آپ کی گہرائی اور پختگی کا عالم یہ تھا کہ اپنے عہد کے بڑے علماء آپ کے درِ علم پر نیاز مندانہ حاضری دیتے تھے۔ اولیاء و صالحین علمی و روحانی منازل طے کرنے کے لیے علمی و روحانی اور زیارتی اَسفار اِختیار فرماتے ہیں۔ حضرت فریدِ ملت ڈاکٹر فریدالدین قادریؒ نے بھی صالحینِ عظام کے طریق پر تقریباً چھ مختلف اَدوار میں علمی و

روحانی اور سیاحتی اَسفار کیے ہیں۔ آپ نے ایران، عراق، ترکی اور شام کے اہم مقامات کی زیارات پر اَہم سفر نامہ لکھا ہے، جواب انگریزی زبان میں نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔

منہاج یونی ورسٹی لاہور کے Translation and Interpretation Centre نے اِس سفر نامے کو فریدِ ملتؒ ریسرچ اِنسٹی ٹیوٹ کے اِشتراک سے اُردو سے انگریزی قالب میں ڈھالا ہے۔ اِس میں مذکور تمام سیاحت شدہ مقامات کے لنکس بھی دیے گئے ہیں، جنہیں کیو آر کوڈ اسکین کر کے وِزٹ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اَلرَّوْضُ الْبَاسِم مِنْ خُلُقِ النَّبِيِّ الْخَاتِم ﷺ

'حضور ﷺ کے اَخلاقِ کریمانہ' کے موضوع پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی یہ تصنیف موجودہ دور میں اُمتِ مسلمہ کے اِصلاحِ اَحوال کے لیے مینارۂ نور ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب دراَصل 60 جلدوں کے *Encyclopedia of Sunna* میں سے 'سیرت و اَخلاقِ محمدی' پر مشتمل ایک حصہ ہے۔

۳۔ والدین اور زوجین: گھریلو رِشتوں میں توازُن (قرآن و حدیث کی روشنی میں)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی یہ اِصلاح آفریں علمی کاوش محض ایک کتاب نہیں، بلکہ خاندانی زندگی کو سنوارنے کا ایک جامع منشور ہے۔ والدین اور زوجین کے حقوق میں توازن قائم رکھنے کے لیے اِنتہائی مفید اور عملی راہ نُمائی فراہم کرتی ہے۔ اِس کی اِنفرادیت یہ ہے کہ زیرِ بحث ہر حدیث کے تحت اس کے عملی فوائد اور مطالب و مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں، جو قاری کی اِصلاح کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اِس کتاب سے یہ حقیقت بھی اُجاگر ہوتی ہے کہ خوش گوار گھریلو زندگی والدین کی بے لوث محبت اور میاں بیوی کے رحمت و سکون پر مبنی پاکیزہ بندھن پر اُستوار ہے۔ والدین کی اِطاعت اور شریکِ حیات کے حقوق میں شرعی اَحکامات کے مطابق اِعتدال اور توازُن قائم کیا جائے۔

۴۔ نظامِ یوسف: نظم و نسق اور قیادت کے قرآنی اُصول
THE YOUSUF FRAMEWORK
(Qur'anic Principles of Management and Leadership)

یہ کتاب پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی قرآن، مینجمنٹ اور لیڈر شپ سیریز کی چوتھی کتاب ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی کہانی دراصل ہر درد مند اور صاحبِ بصیرت اِنسان کی کہانی ہے۔ یہ

کتاب سورۃ یوسف کو محض ایک تاریخی حکایت کے طور پر نہیں بلکہ انسانی زندگی، نفسیات، اَخلاقی اِستقامت، قیادت سازی، بحران کی بہترین تنظیم اور روحانی خود آگہی کے مکمل سفر کے طور پر پیش کرتی ہے۔ سورۃ یوسف کا یہ مطالعہ قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ آزمائشیں رکاوٹ نہیں بلکہ اللہ کی تدبیر کا حصہ ہوتی ہیں اور صبر، حکمت اور اعتماد کے ساتھ یہی آزمائشیں انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہیں۔

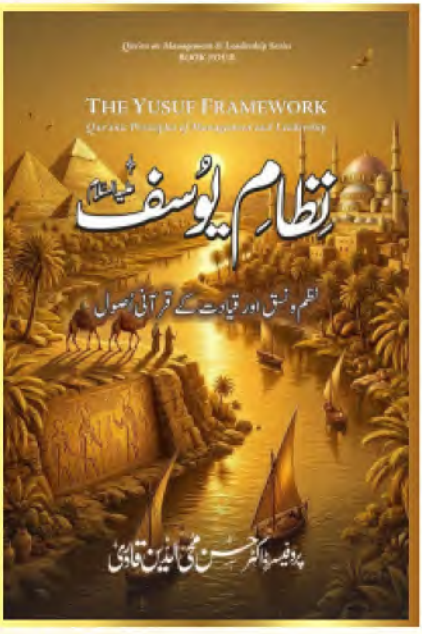

پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری اِس سے قبل 'دستورِ مدینہ' پر اپنی نادر و منفرد تحقیق میں ریاستِ مدینہ اور نظامِ مصطفیٰ کے خدوخال کو نہایت محققانہ اُسلوب میں اجاگر کر چکے ہیں۔ اُسی علمی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اب آپ نے 'نظامِ یوسف' پر تاریخی نوعیت کا یہ گراں قدر کام انجام دیا ہے، جس میں مینجمنٹ اور لیڈرشپ کے تمام اُصول اور خدوخال براہِ راست قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات سے اَخذ کیے گئے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے قرآنی بیانیہ کی گہرائی کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے واضح اور مربوط انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ کتاب ایک ساتھ روحانی مطالعہ، فکری راہ نُمائی اور عملی تربیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، محققین، تربیتی ماہرین، کارپوریٹ لیڈرز اور عام قارئین سب اِس میں اپنے لیے روشنی پائیں گے۔ یہ کتاب ہمیں صرف سیدنا یوسف علیہ السلام کی کہانی نہیں سناتی بلکہ یہ ہمیں اپنی کہانی سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

۵۔ بین المذاہب رواداری: تاریخ، تصوّرات اور مکالماتی اِمکانات

پاکستان کی پہلی یونیسکو چیئر برائے تعلیمِ امن اور بین الثقافتی مکالمہ کے حامل پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی یہ نئی گراں قدر تصنیف اَربابِ اِقتدار، پالیسی سازوں، مذہبی راہ نُماؤں، اسکالرز اور عامۃ الناس کے لیے فکری کشادگی اور تہذیبی ہم آہنگی کی جانب اَہم سنگِ میل ہے۔

یہ کتاب واضح کرتی ہے کہ اِسلام کا اصل چہرہ جبر اور تصادم کا نہیں، بلکہ رحمت، مکالمہ اور اِنسانیت کی بقاو فلاح کا ہے۔ مذاہب کے مابین مکالمہ وقتی مصلحت نہیں، بلکہ اشتراکِ خیر کا بنیادی شرعی واخلاقی اصول ہے۔ اِس کتاب کے مطالعے سے آپ جان سکیں گے کہ اِسلام کے آفاقی پیغام میں تکریمِ انسانیت، مساوات اور اَمنِ عالم کی حقیقی بنیاد کیا ہے؟ کیا میثاقِ مدینہ اِنسانی تاریخ میں کثیر المذاہب معاشرے کا پہلا دستوری منشور تھا؟ کیا تمام مذاہب میں مقدس ہستیوں کی حرمت وناموس کی پاس داری ضروری قرار دی گئی ہے؟

6. FAITH FOR A FRAGILE PLANET
(Environmental Stewardship & Global Sustainability)

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے اس کتاب میں ماحولیاتی بحران کا ایک قابلِ عمل اور حکیمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ ماحول کا تحفظ محض ایک سیاسی ترجیح یا سائنسی ضرورت نہیں، بلکہ یہ ایک مقدس فریضہ ہے جو دینی روایات اور اَقدار کے قلب میں پیوست ہے۔ یہ کتاب ہر اُس شخص کے لیے ایک جامع گائیڈ بک ہے جو عصرِ حاضر کے ماحولیاتی اِضطراب کو محسوس کرتا ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروکار مشترکہ اِنسانی مفادات کی بنا پر کرۂ اَرض کو سنوارنے کا کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں۔

یہ کتاب پالیسی سازوں، ماحولیاتی کارکنوں اور مذہبی راہ نُماؤں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ آیئے! ماحولیاتی بہتری کی اِس cause میں پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کے ساتھ شامل ہوں۔

7. LABOUR RIGHTS
(Historic, Legal and Islamic Perspectives)

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی یہ نئی تصنیف محنت کشوں کے حقوق کا تاریخی، قانونی اور اسلامی تناظر میں فقید المثال مطالعہ پیش کرتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کی حقیقی قوت کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے محنت کشوں اور کمزوروں کے ساتھ کتنا عادلانہ اور نفع بخش رویہ اِختیار کرتا ہے۔ اِسلام کے پیش کردہ اُصولوں کا دیگر مذہبی روایات اور دنیا بھر کے جدید قانونی نظاموں سے تقابلی جائزہ اس کتاب

کا اہم حصہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب پاکستان کے لیبر لاء کا تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہے اور بین الاقوامی معیاراتِ محنت کے اِرتقا کا جائزہ دیتی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں مفید اور قابلِ عمل پالیسی سفارشات تجویز کرتی ہے۔

8. PATHS OF THE LOVERS (Tales of Love, Devotion and Mindfulness)

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری کی یہ انگریزی کتاب سلف صالحین اور اَولیاء کاملین کے اَحوال کا اِیمان اَفروز اور رُوح پرور تذکرہ اور تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کے لیے عُشاق و محبین کی مجالس اور صحبتوں کا حسین بیان ہے۔ یہ کتاب اِیمان اَفروز واقعات وتذکار کا مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر اِنسان میں اِصلاح کا داعیہ بیدار ہوتا ہے اور واقعاتی اندازِ تحریر غیر محسوس طریقے سے قلبی و باطنی کیفیات بدل دیتا ہے۔

9. PAST & PRESENT (How Muslims Enrich Our Society)

شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری کی یہ نئی منفرد کتاب سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، ریاضیات، جدید مالیاتی تکنیک، اے آئی، ڈیجیٹل کرنسی، ماحولیاتی شعور، سائنسی ایجادات، تحقیق و ترقی، حکمرانی، وکالت اور ادارہ سازی کے میدانوں میں مسلمانوں کے کارہائے نمایاں اُجاگر کرتی ہے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں عالمی معاشرے کی تعمیر و ترقی میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ یہ کتاب ان اِمکانات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ آنے والی دہائیوں میں مسلمان کس طرح اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب شیخ حماد مصطفیٰ المدنی القادری کے قائم کردہ علمی و فکری اور تحقیقی ادارے 'بیت الحکمۃ (House of Widsom)' کی جانب سے طبع کی گئی ہے۔

☆ یہ نو (9) کتابیں دراصل ایک ہی چراغ کی نَو (9) کِرنیں ہیں۔ وہ چراغ جو حضرت فریدِ ملتؒ کے علم و عرفان سے روشن ہوا، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی فکر و نظر سے پروان چڑھا، اور اب ان کے فرزندانِ گرامی اور رُفقاءِ علم کے ہاتھوں عالمِ انسانیت کے ہر گوشے کو منور کر رہا ہے۔ عقیدہ و اخلاق، خاندان و معاشرت، ماحول و حکمرانی، مینجمنٹ اور لیڈرشپ، محنت و انصاف، روحانیت و تصوف؛ کوئی دائرہ ان کے علمی فیضان سے خالی نہیں۔ یہ علمی شمعیں بھی اِس بات کی گواہ ہیں کہ قلم کی عبادت اللہ کی بارگاہ میں بے حد مقبول ہے۔

رمضان المبارک 2026ء میں طبع ہونے والی نئی کتب

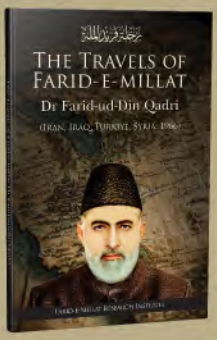

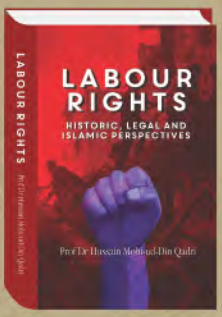

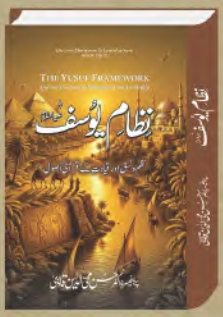

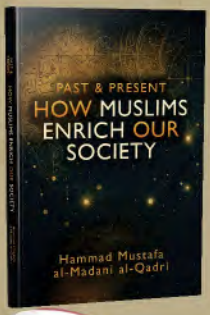

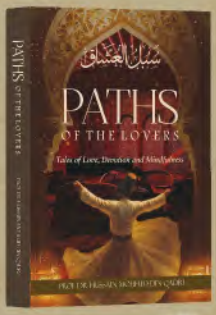

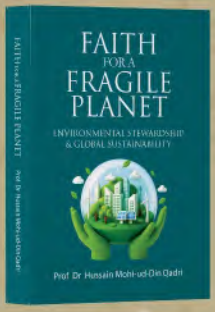

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی،
فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری
موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی
650 سے زائد کتب دستیاب ہیں

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
Apr-2026
Regd CPL No.41

ان شاء اللہ

53 واں سالانہ عرس مبارک

فرید ملت

ڈاکٹر فریدالدین قادری رحمۃ اللہ علیہ

والدگرامی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہرالقادری دامت برکاتہم العالیہ مدظلہ

خصوصی خطاب

بذریعہ ویڈیو لنک

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل

زیرصدارت

صاحبزادہ محمد صبغت اللہ قادری

ایڈمنسٹریٹر دربار فرید ملت

زیرنگرانی

علامہ حافظ عبدالقدیر قادری

ڈائریکٹر دارالعلوم ہذا

بتاریخ 05 اپریل 2026 بروز اتوار بعد از نماز عشاء 16 شوال 1447ھ

بمقام دارالعلوم فریدیہ قادریہ ملحقہ دربار فرید ملت
بستی لوہلے شاہ جھنگ صدر

منہاج انسٹیٹیوٹ آف قرآءت اینڈ تحفیظ القرآن
جھنگ صدر میں داخلہ جاری ہے۔

ثناخوانِ مصطفیٰ ﷺ
الحاج شہباز قمر فریدی صاحب

ثناخوانِ مصطفیٰ ﷺ
محمد شکیل طاہر صاحب
لاہور

ثناخوانِ مصطفیٰ ﷺ
منظورِ نظر حضور شیخ الاسلام
شہزاد برادران صاحب
لاہور

ثناخوانِ مصطفیٰ ﷺ
منظورِ نظر حضور شیخ الاسلام
ظہیر بلالی برادران صاحب
لاہور

اختتام پر لنگر کا خصوصی اہتمام ہوگا

خواتین کیلئے پردے کا اہتمام ہوگا

پروگرام

- قرآن خوانی — بعد نماز فجر تا ظہر
- غسل دربار شریف — بعد نماز ظہر
- چادر پوشی — بعد نماز عصر
- محفل ذکر مصطفیٰ ﷺ — بعد نماز مغرب
- خصوصی خطاب — بعد نماز عشاء

چیف آرگنائزر

محمد جواد حامد

نائب ناظم اعلیٰ ایڈمنسٹریشن واجتماعات
منہاج القرآن انٹرنیشنل

تلاوت

فخر القراء قاری نور احمد چشتی

نقیبِ محفل

صاحبزادہ تسلیم احمد صابری صاحب

شہنشاہ نقابت معروف اسلامی سکالر
صفدر علی محسن صاحب

خصوصی آمد مرکزی قائدین، مشائخ و سکالرز

صاحبزادہ محمد طاہر قادری و تحریک منہاج القرآن جھنگ
0334-6331063 , 0333-6767094